طلوعِ اسلام

ستمبر ۱۹۵۱

بیادِ قائدِ اعظمؒ

صحیح انتخاب اس وقت ہو سکتا ہے

جب آپ کے سامنے انتخاب کیلئے قسم قسم کا مال موجود ہو

خریداری کا فیصلہ

اسوقت ہو سکتا ہے جب آپ تسلی کر لیں کہ قیمت واجبی ہے اور

آپ کا اطمینان

اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ خرید کردہ مال کے استعمال کے بعد دیکھ لیں کہ جیسا کہا گیا تھا مال ویسا ہی نکلا

آپ یونہی پریشان نہ ہوجئے

ہمارے ہاں آئیے اور دیکھئے کہ مذکورہ بالا شرائط کے مطابق آپ کا اطمینان ہوتا ہے یا نہیں۔

ہمارے ہاں ہر قسم کا ہوزری سامان، ٹائیلٹ کے لوازمات، اون، گرم کپڑا، ٹیلرنگ (صرف جنٹس کے لئے) تحفہ جات اور دیگر متفرق اشیائے ضروریات کا بہت بڑا اسٹاک موجود رہتا ہے۔

تھوک کے لئے — سمرسیٹ سٹریٹ کراچی

اور پرچون کیلئے — الفنسٹن سٹریٹ کراچی

تشریف لائیے

نیز ہم ہوزری کا نہایت اعلیٰ مال خود تیار کرتے ہیں۔

کوہِ نور نٹنگ ملز۔ کلیٹن روڈ۔ کراچی

ہماری صناعی کا مرکز ہے۔ نفاست اور پائیداری میں بہت کم ملز اس کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔

نیاز اگیں: ایچ غلام محمد اینڈ برادرز۔ کراچی

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مُرتّب	بدل اشتراک
آٹھ آنے (پاکستانی)	محمد یونس	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
بارہ آنے (ہندوستانی)		غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ

جلد ۴	ستمبر ۱۹۵۱ء	نمبر ۹

فہرستِ مضامین

لمعات	۳-۱۰	نقد و نظر	۴۷-۶۰
بیادِ قائدِ اعظمؒ	۱۱-۲۲	اجتماعِ عید (نظم) (اسد ملتانی صاحب)	۶۱
ہمارا ہمسایہ	۲۳-۳۰	حقائق و عبر	۶۲-۶۸
جنگ	۳۱-۳۵	فسانہ گشت حقیقت، حقیقت افسانہ (نظم) (محمد ایوب صاحب)	۶۹
حج (پرویز صاحب)	۳۶-۳۹		
"یہ صندوقِ کتب..." (عرشی صاحب)	۴۰-۴۶	اشتہارات	۷۰-۷۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

گذشتہ سال، جب محترم لیاقت علی خاں صاحب امریکہ گئے ہیں تو انھوں نے وہاں کہا تھا کہ پاکستان کا نظام، اسلامک سوشلزم پر مبنی ہوگا اور اسلامک سوشلزم وہ نظامِ حیات ہے جس کی نظیر اور کہیں نہیں مل سکتی۔ اس کے بعد دنیا اس انتظار میں رہی کہ معلوم ہو سکے کہ اسلامک سوشلزم کے خط و خال کیا ہیں۔ اس لئے کہ آج ساری دنیا کسی ایسے معاشی نظام کی تلاش میں سرگرداں و حیراں اور مضطرب و بیقرار ہے جو ان مشکلات کا حل پیش کر سکے جس میں آج انسان اس بری طرح سے گرفتار ہے اور جس سے اس کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ

رست از یک بند تا افتاد در بند دگر

پچھلے دنوں امریکی اہل فکر کے کچھ نمائندے (American Seminar) پاکستان آئے۔ انھوں نے کراچی کی ایک تقریب میں براہِ راست دریافت کیا کہ

> ہم اسلامک سوشلزم کے متعلق بہت سنتے چلے آرہے ہیں۔ ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اسلامک سوشلزم کیا ہے اور سوشلزم کے عام تصور میں اور اسلامک سوشلزم میں کیا فرق ہے۔ نیز یہ کہ کیا اسلامک سوشلزم میں انفرادی کاروبار (Private enterprise) کی اجازت ہوگی؟

سوال نہایت صاف، واضح، براہِ راست اور برمحل تھا۔[1] یہ ایک ایسا موقعہ تھا کہ دنیا پر واضح کر دیا جاتا کہ اسلام جس

---

[1] اسی قسم کا سوال اگلے دنوں پروفیسر ٹوئین بی نے چودھری ظفر اللہ خاں صاحب سے کیا تھا۔ اس کے متعلق اشاعتِ رواں میں عنوان "حقائق و عبر" ملاحظہ کیجئے۔

سوشلزم کا نظام پیش کرتا ہے وہ کس طرح روس کی سوشلزم سے مختلف ہے اور اس کے وہ کونسے خصائص و امتیازات ہیں جن کی بنا پر وہ انسانی معاشرہ کو فلاح و کامرانی کی راہوں پر ڈال سکتی ہے۔

اس سوال کا جواب سب سے پہلے مسٹر الطاف حسین صاحب (ایڈیٹر ڈان) نے دیا۔ انھوں نے کہا کہ

چونکہ پاکستان میں ابھی اسلامک سوشلزم کی جزئیات مرتب ہو رہی ہیں اسلئے اس موضوع پر سردست تفصیلی گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اسلامک سوشلزم اور عام سوشلزم میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں انفرادی کاروبار کی تو اجازت ہوگی لیکن اس کا منافع غیر محدود طور پر افراد کے پاس نہیں جا سکے گا۔ اس منافع میں جمہور کا بھی حصہ ہوگا۔ پاکستان اس امر کی کوشش کر رہا ہے کہ وہ سوشلزم اور انفرادی کاروبار میں امتزاج پیدا کر سکے۔

پہلے تو یہ دیکھئے کہ سوال یہ کہ اسلامک سوشلزم کا تصور کیا ہے اور یہ تصور عام سوشلزم کے تصور سے کس طرح مختلف ہے۔ اس کی جزئیات کا سوال نہیں تھا۔ لیکن محترم الطاف حسین صاحب۔ اصل سوال سے صرفِ نظر کر کے اس کی جزئیات کی طرف چلے گئے اور جزئیات کے متعلق یہ کہہ کر ٹال گئے کہ ان کی ترتیب و تدوین ہنوز زیر غور ہے اس لئے اس کے متعلق ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا! یعنی دعوےٰ ہمارا یہ ہے کہ اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے ایک نظام پیش کیا تھا جسے اسلامک سوشلزم کہتے ہیں۔ اور جب کوئی پوچھتا ہے کہ اس اسلامک سوشلزم کے تصور سے مفہوم کیا ہے تو اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ابھی ٹھہریئے۔ اس کی جزئیات زیر ترتیب ہیں۔ جب ان کی تکمیل ہو جائے گی تو پھر پردہ اٹھے گا اور دنیا دیکھ لیگی کہ یہ نظام کس طرح عدیم النظیر ہے۔ سردست جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس نظام میں اس کی اجازت ہوگی کہ اپنے اپنے طور پر جو چاہے ذاتی انداز سے کاروبار کرے لیکن اس کے منافع میں سے ایک حصہ وضع کر کے حکومت کے خزانے میں داخل کر لیا جائے گا تاکہ اسے رفاہِ عامہ کے کاموں میں صرف کیا جائے! آپ ذرا اس کا تجزیہ کر کے دیکھئے کہ بات کیا بنتی ہے۔ آج بڑے بڑے کارخانے، عظیم القدر کاروباری ادارے، بڑی بڑی زمینداریاں، افراد کی ملکیت میں ہیں اور وہ اس تمام کاروبار کو ذاتی طور پر چلا رہے ہیں۔ حکومت ان کی آمدنی پر مختلف قسم کے ٹیکس عائد کرتی ہے اور ان محاصل کو مملکت کے مشترکہ مفاد کے لئے صرف کرتی ہے۔ اسے نظام سرمایہ داری (Capitalism) کہا جاتا ہے۔ یعنی اس نظام میں سارے کا سارا منافع کاروبار کرنے والوں کی جیب میں نہیں چلا جاتا۔ اس میں سے حکومت اپنا حصہ وضع کر لیتی ہے اور اس طرح جمہور اس منافع میں شریک ہو جاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا اسی نظام کا نام اسلامک سوشلزم ہے؟

اس کے بعد ایک دوسرے صاحب، مسٹر سرور حسن صاحب نے فرمایا کہ اسلامک سوشلزم میں انفرادی (ذاتی) کاروبار کی اجازت ہوگی لیکن دولت کو چند افراد کے ہاتھ میں جمع نہیں ہونے دیا جائے گا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ پاکستان اس تصور کو حالاتِ حاضرہ کے مطابق روبہ عمل لانے کی کوشش کر رہا ہے۔

یعنی الطاف صاحب کے نزدیک اسلامک سوشلزم میں ذاتی کاروبار کی اجازت ہوگی۔ صرف منافع کا کچھ حصہ حکومت وصول کرلیگی تاکہ اسے مفادِ عامہ پر صرف کیا جائے۔ لیکن سرور حسن صاحب کے تصور کی رو سے دولت کو چند افراد کے ہاتھوں میں جمع نہیں ہونے دیا جائے گا۔ انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ بالآخر اس کی شکل کیا ہوگی۔ اتنا ہی کہا کہ پاکستان کوشش کر رہا ہے کہ اس تصور کو عملی شکل دے سکے۔ انھوں نے یہ نہ بتایا کہ پاکستان میں اس وقت تک یہ تجربہ کہاں کہاں کیا گیا اور اس کوشش کے کیا نتائج برآمد ہوئے!

اس کے بعد ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے فرمایا کہ اسلامک سوشلزم اس نظامِ زندگی کا نام ہے جس میں ہر ایک کو یکساں مواقع میسر ہوں گے۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ اس ضمن میں پاکستان نے جو قدم اٹھائے ہیں ان میں وہ شش سالہ قومی منصوبہ (Plan) ہے جس کا مقصد عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا اور ملک کی اقتصادیات میں توازن پیدا کرنا ہے۔

یہ تھیں اسلامک سوشلزم کی وہ مختلف تعبیرات جو مفکرینِ امریکہ کے سوال کے جواب میں مفکرینِ پاکستان کی طرف سے پیش کی گئیں۔ آپ ان تعبیرات پر غور کیجئے اور پھر اس دعوے پر کہ اسلام ایک ایسا نظام پیش کرتا ہے جس میں دنیا کے تمام لاینحل مسائل کا حل موجود ہے اور اس کی مثال و نظیر کہیں اور نہیں مل سکتی۔ آپ عقیدت اور تعصب دونوں کو ایک طرف رکھکر سوچئے کہ کیا اسلامی سوشلزم کی یہ تعبیرات فی الواقعہ اس دعوے کی دلیل بن سکتی ہیں؟ کیا آپ کا خیال ہے کہ ان تعبیرات کو سن کر مخاطبین نے اور ان کے بعد باقی دنیا کے اربابِ فکر و نظر نے اس امر کا اعتراف کرلیا ہوگا کہ فی الواقعہ اسلام ایک ایسا معاشی نظام پیش کرتا ہے جو نوعِ انسانی کی تمام پریشانیوں کا حل اپنے اندر رکھتا ہے!

پھر دوسرا غور طلب نقطہ یہ ہے کہ جن حضرات نے یہ کہا کہ اسلامک سوشلزم کی تعبیر یہ ہے، ان کے پاس اس تعبیر کی سند کیا تھی۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میرے نزدیک بہترین معاشی نظام اس قسم کا ہو سکتا ہے تو اس کیلئے اسے کسی سند کی ضرورت نہیں۔ یہ اس کا اپنا خیال ہے اور بس۔ لیکن جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اسلام اس قسم کا معاشی نظام پیش کرتا ہے تو اس کیلئے اسے سند پیش کرنی چاہئے۔ ہم ان حضرات سے پوچھتے ہیں جنھوں نے اسلامک سوشلزم کی مذکورہ صدر تعبیرات پیش کی ہیں کہ ان کے پاس ان تعبیرات کی سند کیا ہے؟

ذرا غور کیجئے کہ ہمارے ہاں اس قدر اہم مسائل پر غور و فکر کس انداز سے کیا جاتا ہے جن پر آج ساری دنیا کے مستقبل کا انحصار ہے۔ مملکتِ پاکستان کی سب سے زیادہ ذمہ دار شخصیت (وزیرِ اعظم) نے امریکہ میں ساری دنیا کو مخاطب کر کے کہا کہ اسلام ایک ایسی سوشلزم پیش کرتا ہے جس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔ لیکن انھوں نے نہ انھیں یہ بتایا اور نہ کسی اور کو کہ وہ اسلامی سوشلزم ہے کیا جس کا ذکر انھوں نے کیا ہے! وہاں سے واپسی کے بعد انھوں نے کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جس سے اہلِ ملک کو یہ معلوم ہو سکے کہ خود ان کے ذہن میں اسلامی سوشلزم کا کیا نقشہ ہے اور اس کے حصول کے لئے کیا کچھ کیا جا رہا ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے نہ مجلس آئین ساز کے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ اسلامی سوشلزم کی صحیح تعبیر متعین کی جائے یا اس کی جزئیات و تضمنات کو مدون کیا جائے اور نہ ہی کوئی اور مجلس اس کام کے لئے مامور کی گئی ہے۔ اب اہلِ امریکہ کے نمائندگان نے براہِ راست سوال کیا کہ آپ کے وزیرِ اعظم ہمارے ہاں اسلامک سوشلزم کا ذکر کر آئے تھے، ذرا اس کا مفہوم تو واضح کر دیجئے۔ تو اس سوال کا جواب وہ کچھ ملا جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے! یہ جوابات وہ تھے جو ان لوگوں نے اپنے کانوں سے سنے۔ لیکن اس اسلامک سوشلزم کا جو مظاہرہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے پاکستان میں دیکھا ہو گا وہ ان کیلئے ان جوابات سے کہیں زیادہ تحیر انگیز ہو گا!

آپ اپنے ہاں کی ان ماجریات کو سامنے رکھئے اور اس کے بعد یہ دیکھئے کہ جب آپ کے مقابلے میں روس والے سوشلزم کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں اس لفظ کا مفہوم کسقدر واضح اور متعین ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس لفظ کو باہر لائے ہی اسوقت تھے جب انھوں نے اس کی تعبیر پہلے متعین کر لی تھی۔ آپ کسی کمیونسٹ سے پوچھئے وہ سوشلزم اور کمیونزم کا مفہوم نہایت جچے تلے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کر دیگا۔ اور اس کے لئے سند (Authority) بھی اس کے پاس موجود ہو گی۔ کہئے کہ ان کے دعوے کے مقابلے میں آپ کا دعوےٰ کیا وزن رکھے گا جہاں ابھی تک اس لفظ کا مفہوم بھی متعین نہیں ہو سکا۔ ان سے پوچھئے تو وہ اس سوشلزم سے متعلق اتنا لٹریچر آپ کے سامنے لا کر ڈھیر کر دیں گے کہ آپ حیران رہ جائیں گے۔ اس کے مقابلہ میں ہمارے ہاں کوئی پمفلٹ تک بھی ایسا نہیں جسے یہ کہہ کر پیش کیا جا سکے کہ اس سے اسلامک سوشلزم کی صحیح تعبیر سمجھ میں آ جائیگی۔ غور کیجئے! دنیا کی دو سلطنتیں (یا قومیں) ہیں جن کا دعوٰی ہے کہ ان کے نظام کی بنیاد سوشلزم ہے۔ ان میں سے ایک کی وہ کیفیت ہے اور دوسری کی یہ حالت۔ اور یہ دوسری قوم یا مملکت وہ ہے جس کا دعوٰی یہ ہے کہ ہماری سوشلزم انسانی دماغ کی اختراع نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ کی تجویز فرمودہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم خوشنما تراکیب سے اپنے آپ کو یا اپنے لوگوں کو شاید مستقل طور پر فریب میں رکھ سکیں لیکن اقوامِ مغرب کی نگاہیں بڑی تیز ہیں اور دور رس ہوتی ہیں۔ انھیں ان الفاظ سے فریب میں نہیں رکھا جا سکتا۔ وہ فوراً بھانپ لیتے ہیں کہ ان الفاظ میں حقیقت کا پہلو کس قدر ہے! لیکن اس تمام جگر خراش داستان میں سب سے زیادہ افسوسناک

ٹکڑہ یہ ہے کہ ہم ان باتوں سے اپنے آپ کی تحقیر نہیں کرتے بلکہ دنیا کی نگاہوں میں خود اسلام کی تذلیل و تنکیر کا موجب بنتے ہیں۔ اور یہ وہ الم انگیز حقیقت ہے جس پر جسقدر ماتم بھی کیا جائے کم ہے۔

اسلامک سوشلزم کوئی چیستان یا معمہ نہیں کہ وہ سمجھ میں نہ آسکے۔ قرآن نے اس کی حدود اربعہ کو اس طرح متعین کر دیا ہے کہ ان کے اندر اپنے زمانہ کے مقتضیات کے مطابق، ضروری تفاصیل و جزئیات از خود متعین کی جا سکتی ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اس انقلاب کی ابتدا انسان کی داخلی تبدیلی سے ہوتی ہے اور خارجی تبدیلی درحقیقت اس داخلی تبدیلی کا پرتو ہوتی ہے۔ اس داخلی تبدیلی کی بنیاد اس حقیقتِ کبریٰ پر ہے کہ اسلامک سوشلزم کے قیام کی ذمہ دار جماعت (امتِ مسلمہ) اپنے معاشرے میں صفاتِ خداوندی کو منعکس کرتی ہے۔ ان صفاتِ الٰہیہ میں سب سے پہلی صفت جس کے تذکرہ سے قرآن کا افتتاح ہوتا ہے "ربّ العالمین" کی صفت ہے، اس کے معنی ہیں کائنات کی ہر شے کی ممکن صلاحیتوں کی کامل نشوونما۔ لہٰذا اسلامک سوشلزم کا نقطہ ماسکہ یا غائت ہر فرد معاشرہ کی تمام ممکن صلاحیتوں کی کامل نشوونما کے سامان و ذرائع بہم پہنچانا ہے۔

لیکن انسانوں کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا امکان اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب انسان کی زندگی قائم رہے۔ اسکی طبعی زندگی کا قیام، رزق (یعنی زندگی کی تمام ابتدائی ضروریات کی بہم رسانی) پر ہے۔ اس لئے قرآن نے یہ واضح الفاظ میں کہدیا کہ (رزق کی ابتدائی ضروریات) کا بہم پہنچانا معاشرے کے اولیں فرائض میں سے ہے۔

وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا (۱۱/۶)

زمین (حدود مملکت) میں کوئی چلنے والا ایسا نہیں ہونا چاہئے جس کے رزق کی ذمہ داری نظامِ خداوندی کے سر نہ ہو۔

رزق کا بنیادی ذریعہ پیداوار ہے اس لئے یہ بھی بتا دیا کہ پیداوار کا سرچشمہ (ارض۔ زمین) کسی کی انفرادی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اس کا مقصد انسانی ضروریات کا پورا کرنا ہے اسلئے اس کے دروازے ہر صاحب ضرورت کیلئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں۔ سورۂ حٰم سجدہ میں اللہ کی صفتِ ربّ العالمین کے تذکرہ کے بعد زمین کے متعلق فرمایا کہ وہ سواء للسائلین (۴۱/۱۰) تمام ضرورتمندوں کیلئے یکساں ہے۔ پیداوار اور اس کے جملہ مشمولات و تضمنات نیز ذرائع مبادلہ کو مال کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مال کے متعلق کہدیا کہ اس کا مقصد نوعِ انسانی (یا اس نظامِ ربوبیت) کا قیام ہے۔ اموالکم التی جعل اللہ لکم قیاما (سورۂ نساء) "تمہارے وہ اموال جنہیں اللہ نے تمہارے لئے وجہِ قیام بنایا" اس مال کو ہمیشہ گردش میں رہنا چاہیئے، جمع نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ مال کا جمع کرنا اصل سرمایہ داری ہے۔ اس ذہنیت کے متعلق قرآن نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ بدبختی ہے اس کیلئے جو مال کو جمع کرتا ہے اور پھر اسے گنتا رہتا ہے (ویل . . . جمع مالا وعددہ) وہ اس زعم باطل میں ہے کہ مال دوام بخشتا ہے (یحسب ان مالہ اخلدہ) ہرگز نہیں (کلا)۔ یہ خیال خام ہے کہ مال میں خلود بخشی کی خاصیت ہے۔ خلود (دوام)

ربوبیت سے حاصل ہوتا ہے اور جمع مال، ربوبیت کی نقیض ہے۔ اسلئے جہنم کا ایندھن (لینبذن فی الحطمۃ) ہے۔ اسی ذہنیت کے متعلق دوسری جگہ فرمایا کہ الھٰکم التکاثر حتی زرتم المقابر۔ "تمہیں دولت کے بڑھانے میں باہمی مقابلہ (تکاثر) نے زندگی کے اصلی مقصود سے غافل کر دیا یہاں تک کہ تم قبروں میں پہنچ گئے۔" یہی وہ سرمایہ ہے جو باپ دادا سے اولاد کی طرف منتقل ہوتا ہے اور اس طرح اس جمع شدہ مال میں اور اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ انہی لوگوں کے متعلق کہا کہ یہ وہ ہیں "تاکلون التراث اکلا لما۔" یہ باپ دادا کی طرف سے منتقل شدہ سرمایہ کو سمیٹ سمیٹ کر کھاتے ہیں۔"

یہ ہے وہ طریقِ سرمایہ داری جس سے دولت چند خاندانوں میں سمٹ کر رہ جاتی ہے (جس طرح آجکل پاکستان میں ہو رہا ہے) اور جس کے متعلق قرآن نے کہدیا تھا کہ دیکھنا کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ کیلا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم (دولت صرف سرمایہ داروں کے طبقہ میں ہی گھومتی رہے)۔

ایسی صورت پیدا ہو سکتی تھی کہ اگر دولت جمع نہ کی جائے تو اسے عیش پرستیوں میں اڑا دیا جائے۔ لیکن قرآن نے اس پر بھی تاکیدی پابندیاں لگا دیں۔ اس نے کہدیا کہ اسراف (ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا) اور تبذیر (بلا ضرورت خرچ کرنا) وہ شیطنت ہے جس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

اب یہ سوال پیدا ہوا کہ جب نہ کوئی فرد جائداد خرید سکتا ہے نہ مال کو جمع کر سکتا ہے، نہ ضرورت سے زیادہ اپنے اوپر خرچ کر سکتا ہے۔ تو زائد از ضرورت مال کو کرے کیا؟ قرآن کہتا ہے کہ زائد از ضرورت مال، اس کی ملکیت ہی نہیں۔ یہ جن کا مال ہے انھیں واپس دیدے[1]۔ یعنی یہ مال افرادِ ملت کی مشترکہ ملکیت ہے۔ اس سے انسانی معاشرہ میں حسن (توازن) قائم رہتا ہے (اسی لئے قرآن نے عدل کے ساتھ احسان) کا حکم دیا ہے۔ یہ مال کس حد تک دیا جائیگا (یا قرآن کے الفاظ میں واپس لوٹایا جائیگا)۔ قرآن نے کہدیا کہ اس سوال کی ضرورت ہی پیدا نہیں ہوتی۔ جو کچھ تمہاری ضروریات سے زیادہ ہے سب کا سب۔ (یسئلونک ماذا ینفقون۔ قل العفو)۔ یہ دیا کس مقصد کیلئے جائے؟ افرادِ انسانیہ کی نشو و نما کیلئے (جسے قرآنی اصطلاح میں زکوٰۃ کہتے ہیں۔ زکوٰۃ کے معنی ہی نشو و نما کے ہیں) چنانچہ اسلامی نظامِ معیشت کے قیام کی ذمہ دار امت (جماعت مومنین) کے متعلق بتا دیا گیا کہ ان کا فریضۂ زندگی یہ ہے کہ ھم للزکوٰۃ فاعلون۔ وہ نوعِ انسانی کی نشو و نما کا انتظام کرنے والے ہیں۔ اسی کا نام نظامِ ربوبیت یا اسلامک سوشلزم ہے۔

یہ ہیں اسلامک سوشلزم کے حدود و ثغور جنہیں قرآن نے متعین کر دیا ہے۔ ان حدود کے اندر تفاصیل اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مرتب کی جا سکتی ہیں۔ اگر یہ مقصد ہر کام کو مملکت کے سپرد کر دینے (Nationalisation) سے ہوتا ہے تو یہی طریق کار اسلامی سوشلزم ہو جائیگا۔ اگر امت کی صوابدید کے مطابق انفرادی کاروبار زیادہ مناسب ہوگا تو اس روش کو اختیار کر لیا جائیگا۔ لیکن یہ فرق صرف تقسیمِ عمل یا طریقِ کار کا ہوگا۔ اصلی مقصد ہمیشہ غیر متبدل رہے گا۔ یعنی تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کے مکمل طور پر نشو و نما پانے کا انتظام کرنا۔

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

---

[1] سورۂ نحل کی آیت فما الذین فضلوا برادی رزقھم . . . . (۷۱/۱۶) بہت بڑی حقیقت کی حامل ہے جس کی تشریح کا یہ موقعہ نہیں۔

پاکستان، حضرت علامہ اقبالؒ کے اس خواب کی تعبیر ہے جو ان کی بصیرت فرقانی پر مبنی تھا۔ لیکن یہ خواب درحقیقت تمہید تھی ان کی اس آرزو کی کہ

ایک ہوں سارے حرم کی پاسبانی کے لئے نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

اس کے لئے ضرورت تھی کہ حضرت علامہ کا پیغام (جو درحقیقت قرآن کا پیغام ہی) مصر سے کاشغر تک عام کر دیا جاتا۔ مضطرب نگاہیں یہ دیکھنے کیلئے بیتاب تھیں کہ ایسا کس طرح ہوگا! لیکن اسے اتفاق سمجھئے یا کچھ اور، ایک ایسا واقعہ ظہور میں آگیا جو اس آرزو کی تکمیل کا کامیاب ذریعہ بنتا دکھائی دے رہا ہے۔ مملکتِ مصریہ نے ڈاکٹر عزام بک جیسی شخصیت کو اپنی سفارت کیلئے منتخب کیا اور انھوں نے یہاں پہنچکر فکرِ اقبال کو عربی ممالک تک پہنچانے کی بلند خدمت کو اپنی زندگی کا فریضہ قرار دے لیا۔ پیامِ مشرق کا عربی ترجمہ جس تیزی سے عربی ممالک میں مقبول ہو رہا ہے اس سے یہ امید بندھتی ہے کہ اس تخم صالحہ سے ایک شجرِ طیب بارآور ہوگا۔ ایک طرف اگر شاہِ فاروق نے اس ترجمہ پر ہدیۂ تہنیت بھیجا ہے تو دوسری طرف انڈونیشیا کی نوزائیدہ اسلامی مملکت نے اس کے کئی سو نسخے اپنے ہاں کیلئے منگائے ہیں۔ چنانچہ پیامِ مشرق کا یہ عربی ترجمہ مراکش سے لیکر انڈونیشیا کے مسلمانوں تک وحدتِ فکر و نظر کا ذریعہ بن رہا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ وحدتِ فکر و نظر کے بعد وحدتِ ملت دو قدم بھی دور نہیں رہ جاتی۔ پاکستان نے تو خیر اس ضمن میں کیا کرنا تھا۔ اس کی "احسان شناسی" کا تو یہ عالم ہے کہ یہاں کرشن کے جنم دن اور گورو گوبند سنگھ کی وفات کی تقریبات پر سرکاری دفاتر میں کاروبار معطل کر دیا جا سکتا ہے لیکن خود پاکستان کے موسس کی یاد میں ایک دن کی تعطیل گوارا نہیں کی جا سکتی۔ یہ کچھ تائید غیبی سی ہے کہ پیغام اقبال کو عربی ممالک تک پہنچانے کا ایسا سامان پیدا ہو گیا۔ ڈاکٹر عزام بے اب ضربِ کلیم کا ترجمہ کرنے میں مصروف ہیں اور ان کا عزم راسخ ہے کہ وہ بتدریج پورے کے پورے اقبال کو (معہ خطباتِ تشکیلِ جدید) عربی میں منتقل کر دینگے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اس امرِ عظیم کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ یہ فی الواقعہ بہت بڑا کام ہے جس کا انھوں نے بیڑا اٹھایا ہے۔ سیاسی سفیر آئیں گے اور جائیں گے لیکن ڈاکٹر عزام بے کا یہ کارنامہ انھیں ثبتِ دوام عطا کر دیگا۔ واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض۔

طلوع اسلام (اپنے زمانہ عارضی التوا کو چھوڑ کر) قریب تیرہ برس سے قرآن کریم کی آواز بلند کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی مخلص کوششوں کو نوازا ہے اور اب بتدریج پاکستان کا روشن خیال اور سلیم القلب طبقہ قرآن کی اہمیت کو سمجھنے لگا ہے۔ اس آسمانی پکار کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کیلئے ملک کے اطراف واکناف میں، ادارۂ طلوعِ اسلام کی شاخیں قائم کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس راہ میں سب سے پہلا قدم احباب لاہور نے اٹھایا ہے۔ کراچی کے بعد یہ حق لاہور ہی کو پہنچتا تھا۔ لاہور و نواح لاہور کے قرآن سے شغف رکھنے والے احباب کی اطلاع کیلئے اس شاخ کا پتہ درج ذیل ہے:-

ادارۂ طلوع اسلام، لاہور برانچ۔ دارالقرآن۔ نسبت روڈ۔ لاہور

اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ لاہور کے یہ مخلص کارکن، طلوع اسلام کے پیغام کو اپنی صوابدید کے مطابق، اپنے طور پر، مختلف طریقوں سے آگے پھیلاتے رہتے ہیں۔ اسی اعتبار سے انھوں نے اپنے آپ کو ادارۂ طلوع اسلام کی شاخ کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان احباب کی کوششوں کو بارآور فرمائے۔

بیادِ قائداعظمؒ

حلقۂ گردِ من زنید اے پیکرانِ آب و گل آتشے در سینہ دارم، از نیاگانِ شما

اگرچہ ایک بڑے اور چھوٹے آدمی کے روزانہ معمولاتِ زندگی میں بھی فرق ہوتا ہے لیکن ایک بڑے انسان کی صحیح عظمت کا اندازہ اسوقت لگتا ہے جب شاہراہِ حیات کا کوئی دشوار گذار اور صعوبت انگیز دوراہہ سامنے آجائے اور اس وقت خطرہ یہ ہو کہ ایک غلط قدم پوری کی پوری قوم کو منزلِ مقصود کی طرف لے جانے کے بجائے بربادی و رسوائی کے جہنم کی طرف لے جائیگا۔ یہی وہ مقام ہوتا ہے جو ایک عظیم المرتبت انسان کی اصابتِ رائے، قوتِ فیصلہ، عزم و استقلال، پامردی و جواں ہمتی، تدبر و تحمل، صبر و شکیب، قرار و سکون، نظم و ضبط، ذہنی توازن، جذباتی اعتدال کی صحیح صحیح کسوٹی بنتا ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران میں سالارِ کاروانِ ملت، قائداعظم مرحوم و مغفور کے سامنے اس قسم کے کئی دوراہے آئے جہاں سے وہ بکمال حزم و احتیاط، تبسم بہ لب و خندہ بہ پیشانی، افرادِ کارواں کو بہ صحیح و سلامت، رواں دواں، جانبِ منزل لئے بڑھتے چلے گئے۔ لیکن ان تمام دشوار گذار اور حوصلہ آزما مراحل میں، ہمارے نزدیک سب سے زیادہ صعوبت انگیز اور ہمت شکن وہ مقام تھا جب ۱۹۴۰ء میں، لاہور کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں پاکستان کا ریزولیشن پاس ہوا ہے۔ شاید کسی کو یاد بھی نہ رہا ہو کہ اُسوقت ملتِ اسلامیہ پر کسقدر نازک وقت آچکا تھا جب بیگانوں کا خنجرِ عریاں اور خود اپنوں کا دشنۂ پنہاں، اس کی رگِ حیات کو منقطع کر دینے کی فکر میں غلطاں و پیچاں تھے۔ عین انہی دنوں جب لاہور میں لیگ کا اجلاس ہونے والا تھا، ہندوؤں کی حیلہ سازیوں اور روباہ بازیوں نے رام گڈھ میں کانگریس کا اجلاس منعقد کیا جس کی صدارت کے لئے ابوالکلام صاحب آزاد کا مہرہ آگے بڑھایا گیا۔ پنجاب میں سر سکندر حیات کی حکومت قائم تھی جن کا مسلکِ زندگی یہ تھا کہ

با ما شراب خورد و با زاہد نماز کرد

وہ بظاہر مسلم لیگ کے سربرآوردگان میں سے بھی تھے لیکن در پردہ مخالفینِ تحریکِ پاکستان کے رفیق و صلاح کار بھی۔ لیگ کے اجلاس سے کچھ عرصہ پہلے، ابوالکلام صاحب آزاد ان سے لاہور جا کر ملے تھے۔ ان سب کے علاوہ ایک اور مصیبت بھی تھی۔ خاکساروں کی تحریک اس زمانے میں زوروں پر تھی اور اس کے ساتھ ہی بانیٔ تحریک کی ناعاقبت اندیشیاں بھی اپنے شباب پر۔ یہ تھا وہ پس منظر جس میں لیگ کا وہ معرکۂ آرا اجلاس منعقد ہوا جس نے قوم کی تقدیر پلٹ دی اور ہندوستان کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔

آج اس واقعہ کو قریب ساڑھے گیارہ برس ہو چکے ہیں۔ ملتِ پاکستانیہ میں سے جو لوگ اُسوقت شریکِ رستخیز نہ تھے، انھیں تو چھوڑیئے۔ جو شاملِ ہنگامہ تھے ان میں سے بھی اکثر کے ذہن میں اس اہم اجلاس کے نقوش دھندلے پڑ چکے ہوں گے۔ طلوعِ اسلام

نے اپنی اشاعت بابت اپریل ۱۹۴۰ء میں اس انقلاب انگیز اجلاس اور اس کے لرزہ انگیز پس منظر کی آنکھوں دیکھی داستان "لمعات" میں شائع کی تھی۔ ہم زعیم ملتِ اسلامیہ محترم قائداعظمؒ کی بارگاہ میں اس سے بڑا خراجِ عقیدت اور کچھ نہیں پیش کر سکتے کہ ان "لمعات" کو آج گیارہ سال کے بعد زینت دہ اوراقِ طلوع اسلام کیا جائے تاکہ اس سے یہ حقیقت ایک بار پھر نکھر کر سامنے آجائے کہ ایسے مشکل اور نازک وقت میں امیر کاروانِ ملت اسلامیہ کا تدبر و استقلال کیا کچھ کر دکھایا کرتا تھا۔ سنئے اور غور سے سنئے۔

شاید کہ خود را باز آفرینی

لمعات

(طلوع اسلام، اپریل ۱۹۴۰ء)

اللہ رے بساطِ سیاست کی فسونگرانہ چہرہ بازیاں! مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے انعقاد کی دھوم مچی۔ وھائٹ ہال کے اربابِ حل و عقد کی آنکھیں ایک طرف منٹو پارک[1] (لاہور) کی طرف لگ رہی تھیں۔ رام گڈھ[2] میں جمع ہونے والے گنگا جمنی مہاشوں کے کان دوسری طرف، ہر تہ کھٹکنے پر کھڑے ہو رہے تھے۔ انگریز کو اپنی ساحرانہ فسوں سازیوں کی گرفت ڈھیلی ہو جانے کا خطرہ تھا۔ ہندوؤں کو رام راج کے منصوبے خوابِ پریشاں بنتے نظر آرہے تھے۔ وہ متحدہ قومیت کا دامِ ہمرنگِ زمیں کہ جس کے حلقے انگریز کی ہوسِ استعمار پرستی کے ریشوں سے بٹے اور ہندو کے جذبۂ مسلم کشی کے ہاتھوں کسے گئے، تارِ عنکبوت بنتا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک جداگانہ قوم کے لئے ایک جداگانہ حکومت کے تصورات میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑنے والی تھی۔ سرزمینِ پنجاب کا ایک ایک ذرہ ابھر ابھر کر ۲۱ مارچ کے استقبال کے لئے ہمہ تن چشم بن رہا تھا۔ ہندوستان کے ہر مسلم گھرانے میں اس تقریب کی آمد آمد پر شبِ عید کا سماں بندھ رہا تھا۔ جگہ جگہ سے خاص تیاریوں کی اطلاعات موصول ہو رہی تھیں جو اس امر کی آئینہ دار تھیں کہ لاہور نو کروڑ فرزندانِ توحید کی نگاہوں کا مرکزِ جانفزا بن رہا ہے۔ غرضیکہ ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی تھی اور ہر دھڑکنے والا قلب محسوس کر رہا تھا کہ ہندوستان کے سمائے سیاست پر ایک آفتابِ تازہ کے طلوع کے سامان ہو رہے ہیں۔ شپرہ چشم غیروں کو اس آفتابِ جہانتاب کی ضوفشانیوں سے جو گھبراہٹ ہو رہی تھی وہ بالکل بجا اور درست تھی۔ لیکن ملتِ اسلامیہ کی شوریدہ بختی کہ خود اپنوں میں سے بھی کچھ ایسے تھے جو اس تقریب کی کامیابی میں اپنے طرۂ امتیاز کی خمیدگی محسوس کرتے تھے۔ جو سمجھتے تھے کہ مسلمانانِ ہند کا یہ عدیم النظیر اجتماع اور اس اجتماع کے تحیر انگیز نتائج ان کے چہروں کو بے نقاب کر دیں گے، صفِ مخالف کی بھانپنے والی نگاہوں نے ان کے چہروں کی اس اڑتی ہوئی رنگت کو دیکھا اور ایک نرم رو قاصد لاہور[3] بھیجا گیا۔ تخلیہ میں وہ ملاقات ہوئی جس کی تفصیل کے متعلق۔ کرانا کا تبیں راہم خبر نیست۔ اجلاس کی تاریخیں قریب تر آتی گئیں۔ لوگوں کے ولولۂ شوق میں گرم جوشی بڑھتی گئی۔ تیاریاں زور پکڑتی گئیں۔ آنے والے منظر کا تصور نگاہوں میں چمک، قلوب میں مسرت آفریں تموج اور دماغوں میں کیف طیب پیدا کرنے لگا۔ حوصلوں نے انگڑائیاں لیں، ولولوں نے کروٹ بدلی، ہمتیں

---

[1] جہاں مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا تھا۔
[2] کانگریس کا سالانہ اجلاس بزیرِ صدارت ابوالکلام صاحب آزاد۔
[3] ابوالکلام صاحب آزاد جنہوں نے سر سکندر حیات سے ملاقات کی تھی۔

آنکھیں ملتی ہوئی بیدار ہوئیں، عزائم نے قدم بڑھایا، ارادوں نے کمرِ ہمت باندھی اور یہ قافلۂ شوق رواں دواں جادہ پیما ہوا۔

اُدھر یہ گرمجوشیاں تھیں اور اِدھر بعض چہروں کے ہلکے ہلکے تبسم پنہاں، آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے کرتے جا رہے تھے۔ لیکن کیفِ عزائم میں سرمست کاروانِ شوق کو فرصت کہاں کہ پردوں کے ارتعاشِ غیر محسوس سے منظرِ پس پردہ کا جائزہ لے لے۔ وقت گزرتا گیا۔ مہینے ہفتوں میں بدلتے گئے کہ عین شروع مارچ میں حکومتِ پنجاب کے قصرِ فلک بوس سے جماعتِ خاکساران پر پابندیاں عائد کرنے کے احکامات نافذ ہو گئے۔ لیکن اس کاروانِ شوق نے اس پر بھی نہ سمجھا کہ

تیرے نشتر کی زد شریانِ قیسِ ناتواں تک ہے

ہفتے دنوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ خاکساروں کے خلاف پابندیوں نے فضا میں کچھ تموج پہلے سے پیدا کر رکھا تھا کہ جلوس صدر مسلم لیگ کے عین دو روز پہلے۔ شام کے قریب یہ خبر آگ کی طرح اطراف واکنافِ ہند میں دوڑ گئی کہ لاہور میں خاکساروں پر گولی چلا دی گئی ہے۔ تمام شہر ماتم کدہ بن گیا۔ کرفیو آرڈر جاری ہو گیا۔ دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی۔ شہر پر فوج اور پولیس کا اقتدار قایم ہو گیا۔ ساری آبادی پر ہلا کا سناٹا چھا گیا۔ ہر شخص ہراساں۔ ہر متنفس متوحش۔ نہ باپ کو بیٹے کی خبر، نہ بھائی کو بھائی کا علم۔ کاروبار بند۔ دل پژمردہ۔ ہمتیں پست۔ ولولے افسردہ۔ اجلاس میں صرف ایک دن باقی رہ گیا اور لاہور کی یہ حالت! شریک ہونے والوں میں سے کچھ اپنے اپنے مقام سے روانہ ہو چکے۔ کچھ ٹکٹ بدست، اسٹیشنوں پر بیٹھے۔ کچھ راستے کے مقامات میں وقتی آرام کے لئے ٹھہرے ہوئے۔ ہر ایک حیران کہ اب کیا ہوگا۔ ہر ایک پریشان کہ اب کیا بنے گا۔ صدرِ جلسہ[1] دہلی میں ہیں۔ استقبالیہ کمیٹی لاہور میں۔ تار پر تار آ رہے ہیں۔ ٹیلیفون پر ٹیلیفون ہو رہا ہے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ جیسا کہ مسٹر جناح نے بعد میں بتایا، انھیں نہایت "مخلصانہ" مشورہ دیا گیا کہ اجلاس ملتوی کر دیا جائے۔ پریشانی اور وحشت کے یہ سامان ایک طرف۔ اور وہ عزم و ہمت کا پیکر دوسری طرف کہ نامساعدتِ حالات کی تیز و تند موجیں اٹھتی ہیں اور اس روشنی کے بلند و محکم مینار سے ٹکرا کر خاسر و نامراد واپس لوٹ آتی ہیں۔ فی الحقیقت ایک اولوالعزم انسان کے امتحان کا اس سے زیادہ نازک موقعہ کم ہی آیا ہوگا۔ اس تدبر و استقلال کے مجسمہ نے یہ سب کچھ سنا اور دیکھا۔ لیکن اپنے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش نہ آنے دی کہ وہ دیکھتا تھا کہ اگر ایسے نازک وقت میں اس کا پاؤں پھسل گیا تو مسلمانانِ ہند کے مستقبل کا آبگینۂ حیات اس کے ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہو جائے گا۔ اس نے ان تمام پریشانیوں کے ہجوم کو جھٹک کر الگ کر دیا اور ۲۰ کی سہ پہر کو اعلان کر دیا کہ لیگ کا اجلاس ہوگا اور اپنے معینہ نظام الاوقات کے مطابق، بلا رد و بدل ہوگا۔ البتہ اس حادثہ الم انگیز کے پیشِ نظر کہ جس نے مسلمانانِ ہند کے طرب آگیں قلوب کو کاشانۂ حزن و ملال بنا دیا ہے، جلوس نہیں نکالا جائے گا۔ اس اعلان کے ۳ گھنٹے بعد یہ پیکرِ عزم و استقلال حسبِ انتظاماتِ سابقہ، اسپیشل ٹرین کے ذریعہ عازمِ لاہور ہو گیا۔

لاہور پہنچ کر قائدِ ملت نے کیا کچھ کیا؟ یہ تو ان کی چشمِ پرنم کے آنسوؤں سے پوچھئے کہ جن کے ایک ایک قطرہ میں سینکڑوں قیامتیں تڑپتی نظر آ رہی تھیں۔ البتہ دوسروں نے جو کچھ دیکھا اس سے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا ایک فرضِ کفایہ کی ادائیگی کے لئے لوگ

---

[1] قائد اعظم محمد علی جناح؂

اپنے آپ کو کھینچتے ہوئے جانب قبرستان لئے جا رہے ہیں۔ چہرے اداس۔ دل پژمردہ۔ آنکھوں میں آنسو۔ شہر میں ہو کا عالم۔ ہر شخص ایک غیر محسوس خوف سے ہراساں، سینوں میں آہ و فغاں کا قیامت خیز تلاطم۔ لیکن حلق "قانونی" پابندیوں کی ریشمیں رسیوں میں جکڑا ہوا۔ دل الم جانگداز کی آتش خاموش سے سوختہ۔ لیکن لب "آئینی" قیود کی مصیطرانہ بندش سے سربمہر کہ دھواں تک نہ نکلنے پائے۔ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کے پاس نہیں جاتا کہ کوئی دیکھ نہ پائے۔ اگر کوئی ڈرتا کانپتا سہما ہوا چلا بھی گیا تو اِدھر اُدھر دیکھتا ہے کہ کوئی بھانپ تو نہیں رہا۔ کوشش کرتا ہے کہ کچھ کہے لیکن جذبات کا تلاطم اور عواقب کا خوف دامنگیر ہو جاتا ہے۔ وہ کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن اس کی چشم حیرت سے ڈھلکتے ہوئے آنسو چپکے چپکے اس کے غم و الم کی داستانِ خموش کا ایک ایک لفظ کہہ ڈالتے ہیں۔ سارا شہر ایک جیل خانہ معلوم ہوتا تھا کہ جہاں کا ذرہ ذرہ ایک مستقل پاسباں ہو۔ اِدھر اُدھر استقبال کے دروازے، نیم تیاریوں کی حالت میں، دو دن پیشتر کی افراتفری کے مرثیہ خواں۔ گری ہوئی جھنڈیاں، ٹوٹے ہوئے قطعات، یوں اِدھر اُدھر بکھرے پڑے جیسے کسی طوفانِ بلاخیز کے بعد بہہ جانے والے مکانات کے بقیہ آثار۔ کسی مکان سے ایک چیخ کی دردناک آواز، دو دن کے لٹے ہوئے سہاگ کی داستانِ الم انگیز سے فضائے آسمانی کو ماتم کدہ بنا رہی ہے۔ کسی گھر سے ضعف و نقاہت میں ڈوبی ہوئی آہِ لرزاں، ایک پیرانہ سال بیوہ کی زندگی کے آخری سہارے کے ٹوٹ جانے کی فریاد بنکر کنگورۂ عرش کو ہلانے جا رہی ہے۔ کسی معصوم کے چہرے کی زردی اس کے تازہ داغِ یتیمی کا پتہ دے رہی ہے۔ کسی گوشے سے زخمیوں کے کراہنے کی صدائے دردناک اس حقیقت کی داستان سرا ہے کہ زندگی کا بوجھ ان کے لئے کس قدر ناقابلِ برداشت بن چکا ہے۔ مشہدِ خاکساراں کی خاک کے ذراتِ بیگناہ مسلمانوں کے خونِ ناحق سے رنگیں قبا بظاہر مرنے لیکن فی الحقیقت جینے والوں کے دمکتے ہوئے چہروں اور چمکتی ہوئی پیشانیوں کی جیتی جاگتی تصویریں۔ اور ان سب کے ساتھ۔ شاہی مسجد کے جنوبی مینارے[۱] کہ جن کی آنکھوں نے دو دن پہلے مظلوم مسلمانوں کو تڑپتے پھڑکتے، غلطیدۂ خاک و خون، مسلح سپاہیوں کی وحشت اور درندگی اور ہوسِ خون آشامی کا شکار بنکر ذبح ہوتے دیکھا تھا، بحضور ربِ ذوالانتقام دست بدعا تھا کہ اے خدائے رؤف و رحیم! صدقہ اس مردِ قلندر[۲] کے مقدس آنسوؤں کا جو آج ہمارے سایہ میں محو خواب ہے، سرزمین لاہور کو غرق ہونے سے بچا لے کہ اس سرزمین کے ذرات کو اس مردِ مومن کی کفش بوشی کی سعادت حاصل ہے جس نے تیرے بندوں کو تیرے نام پر کٹ مرنے کا بھولا ہوا سبق پھر سے یاد دلایا۔

ہاں یہ تھا لاہور اور یہ تھی اس کی فضا جس میں مسلم لیگ کا اجلاس شروع ہوا۔ شروع ہوا تو اس افسردگی اور پژمردگی میں۔ لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک مردِ مخلص کا یقینِ محکم و عملِ پیہم کس طرح نبضِ کائنات میں نئے سرے سے تموج پیدا کر سکتا ہے۔ اس کا پنجۂ جنوں طاغوتی قوتوں کی فریب کاریوں کے دلآویز نقابوں کو کس طرح تار تار کر دیتا ہے۔ اس کا حسنِ تدبر سیاسی گتھیوں کی پیچ در پیچ گرہوں کو کس حسن و خوبی سے کھولتا جاتا ہے۔ ۲۴ مارچ کی شام کو پرچم لہرانے کی مختصر سی رسم میں اس مردِ مخلص نے آکر صرف اتنا ہی کہا کہ

---

[۱] خاکساروں سے تصادم، بادشاہی مسجد کی جنوبی سمت، چوک میں ہوا تھا۔
[۲] حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ۔

میں ابھی ابھی میو ہسپتال سے اپنے جگر کے ٹکڑوں۔ اپنے زخمی بیٹوں کو دیکھ کر آرہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری مصیبت کس درجہ قیامت خیز ہے۔ لیکن جذبات کے تلاطم میں نہ بہہ جاؤ۔ مردانہ وار مقابلہ کرو۔ تم دیکھو گے کہ مظلوم کی پوری پوری داد رسی ہوگی۔ حق وانصاف کا بول بالا ہوگا۔

کہنے والے نے کچھ ایسا ہی کہا۔ لیکن سننے والوں نے محسوس کیا کہ یہ الفاظ ظلمت کدۂ لاہور پر نور کی کرنیں بن کر برسے جنھوں نے یاس و حزن کی وحشت ناک تاریکی کا دامن چاک کر کے چاروں طرف شعاعِ امید دوڑا دی۔ دلوں میں پھر سے حرکت محسوس ہوئی۔ نگاہوں میں از سرِ نو روشنی پیدا ہوگئی۔ افسردہ چہروں پر خونِ نو کے کچھ کچھ آثار نظر آنے لگے۔ در و دیوار سے زندگی کے نقوش پھر سے ابھر کر سطح پر دکھائی دینے لگے۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد کرفیو آرڈر کے انسانیت سوز، بھیانک عفریت کے ٹکڑے فضائے آسمانی میں منتشر دکھائی دینے لگے۔ اجتماعات پر جو پابندیاں[1] عائد ہو چکی تھیں ان کی رسیاں ڈھیلی ہوگئیں۔ شہر والوں کے دلوں سے پھر سے خوف و ہراس کے تپ دق کے جراثیم دُور ہوئے۔ قبرستان کے سے خاموش گلی کوچے پھر سے زندہ انسانوں کی بستیاں معلوم ہونے لگیں۔ پنڈال کی رونق بڑھی۔ لوگوں کی آمد و رفت شروع ہوئی۔ دوسرے دن (۲۲ مارچ) بعد دوپہر کے پہلے کھلے اجلاس میں کم از کم پچاس ہزار کا مجمع تھا۔ نواب سر شاہ نواز خاں صاحب[2] صدر استقبالیہ کمیٹی نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا۔ یہ خطبہ حسبِ دستور پہلے سے چھاپ رکھا تھا۔ لیکن قدرت کا تماشہ دیکھئے کہ کسی کو یاد نہ رہا کہ اس میں سے وہ حصہ خارج کر دیا جائے جو خواہ مخواہ سرود بہ مستاں یاد دہانی بن جائے گا۔ پڑھتے پڑھتے حکومتِ پنجاب کے "درخشندہ" کارناموں کا ذکر آیا تو ۱۹ مارچ کے حادثۂ محزنہ کی یاد نے لوگوں کے دلوں میں ایک تلاطم پیدا کر دیا اور پنڈال نفرین و لعنت کے تہلکہ انگیز نعروں سے گونج اٹھا۔ مسلمانانِ لاہور نے تین دن سے جن جگر گداز جذبات کو اپنے سینوں میں دبائے رکھا تھا آج وہ پوری آزادی کے ساتھ باہر آگئے۔ مغموم دلوں کی وہ آتشِ خموش جو اتنے دنوں سے بایں نمط اندر ہی اندر سلگ رہی تھی کہ اس کا دھواں تک بھی اوپر نہ اٹھنے پائے، اُس وقت اپنی پوری عناں تابی سے بھڑک اٹھی۔ یہ مظاہرہ محض رسمی نہ تھا کہ حلق کے اوپر سے آوازیں اٹھ رہی ہوں۔ یہ تو عمق قلب سے نکلی ہوئی آہیں تھیں جنھیں سنکر جگر خون ہو کر آنکھوں کے راستے بہ نکلنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ سب کچھ سامنے تھا اور چشمِ فلک، عبرت و موعظت کے اس دل دوز منظر کو حیران و ششدر دیکھ رہی تھی کہ اللہ اکبر! یہ کیا انقلاب ہے؟ اس کے بعد ہوا کا رخ بدل گیا۔ اس خوف و ہراس کا ردِ عمل جس نے چار روز سے خطۂ لاہور کو وحشت کدہ بنا رکھا تھا، پورے جوش و خروش کی صورت میں رونما ہوا۔ گوشے گوشے سے "مردہ باد" کے نعرے سُنائی دینے لگے۔ گلی کوچے سے لعنت و ملامت کی آوازیں اٹھنی شروع ہوگئیں۔ اس کا انتظام تو کر لیا جا سکتا تھا کہ یہ چیزیں لاہور سے باہر کی دنیا تک نہ جانے پائیں لیکن اس کا کیا علاج کہ ملک کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے مسلمانوں نے ان باتوں کو اپنے کانوں سے سنا اور اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے بعد تو رنگ ہی بدل گیا۔ کوئی جلسا ایسا نہ تھا جس میں نفرت و ملامت کے نعرے بلند نہیں ہوتے تھے۔ کوئی اجتماع ایسا نہ تھا جس میں خونِ شہداء کی قیمت کا مطالبہ نہیں کیا جاتا تھا۔

---

[1] لاہور میں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ ہو چکا تھا اور بعض حلقوں میں خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ شاید یہ پابندی مسلم لیگ کے اجلاس کو بھی اپنی زد میں لے لیگی۔

[2] موجودہ نواب صاحب ممدوٹ کے والد بزرگوار جن کی مساعیِ حسنہ سے لیگ کا اجلاس منعقد ہوا تھا۔

سب جکٹ کمیٹی میں پانچ پانچ گھنٹے تک بحث رہی تو اسی مسئلہ پر کھلے اجلاس میں ہر دس منٹ کے بعد تقاضا ہوا تو اسی کا۔ دو دن تک یہ ہی مطالبہ ہر شخص کی زبان پر تھا۔ اس ہنگامۂ بحث و جدل، اس سیلابِ جوش و خروش میں مسٹر جناح نے جس ہمت۔ استقلال۔ عزم راسخ۔ تدبر۔ صلاحیت، ضبط و انضباط کا ثبوت دیا، آنے والا مورخ جب اسے دیکھے گا تو بلا تامل پکار اٹھے گا کہ فی الواقعہ ایک "قائداعظم" کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ مبارک ہے وہ قوم جسے ایسا "رہبر فرزانہ" ملجائے اور مستحق صد تحسین ہے وہ انسان جسے مبدء فیض کی کرم گستری سے یہ نعمتیں یوں فراواں نصیب ہو جائیں۔ کامل دو دن تک یہ ہی ہنگامہ رہا۔ اور بالآخر ۲۴ کی شب، آخری کھلے اجلاس میں، جب کہ پنڈال میں کم از کم ایک لاکھ کا مجمع ہوگا۔ مجمع کیا، جوش و جذبات کا بحرِ متموج جو ہر متصادم عنصر کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جانے کے لئے کف بر دہان موجزن تھا۔ ایسے وقت میں خاکساروں کے حادثۂ فاجعہ کے متعلق رزولیوشن پیش کرنا اسی صاحبِ ہمت مرد دانا کا کام تھا۔ جسے اللہ نے اس پیرانہ سالی میں وہ جرارت و حوصلہ دیا ہے جو نوجوانوں کو بھی شرما دے۔ صاحب صدر[1] نے اس رزولیوشن کو پیش کیا اور اس درد و اثر میں ڈوبی ہوئی تقریر کے ساتھ جس کے لفظ لفظ سے اس کے قلبِ محزوں کی تڑپ اور خلش ابلتی نظر آ رہی تھی۔ رزولیوشن پیش کیا اور ایک لاکھ کے مجمع میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جس نے اس کی مخالفت میں ایک آواز بھی اٹھائی ہو۔ صاحب صدر نے پوچھا کہ کیا یہ چاہتے ہو کہ اس پر کھلے اجلاس میں بحث و تمحیص ہو۔ لیکن سب نے کہدیا کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ اس سے اندازہ فرمایئے کہ مسلمانوں کو اپنے اس ملی راہ نما پر کس قدر اعتماد ہے۔ وذلك فضل الله يؤتيه من يشاء

لیگ کے اجلاس کی ابتدا، اور اختتام میں کیفیات و جذبات کا جو نمایاں فرق سامنے آیا اس سے یہ چیز بالکل نمایاں تھی کہ اب مسلمانوں میں کس قدر بیداری پیدا ہو چکی ہے اور مسٹر جناح کی عظمت کس قدر عوام کے دلوں میں گھر کر چکی ہے۔ لاہور کا حادثہ ہر دیدۂ بینا کو خون کے آنسو رلا دینے کا موجب تھا۔ بایں ہمہ، وہ جو کہتے ہیں کہ ہر شر میں ایک خیر کا پہلو بھی ہوتا ہے، اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو نہ مسلمانوں کے ضبط و انضباط کا امتحان ہو سکتا، نہ مسٹر جناح کی بلندیٔ مرتبت کا صحیح صحیح اندازہ کیا جا سکتا۔ نہ لوگوں کو اس حد تک محسوس ہو سکتا کہ مسلم لیگ ان کے مفاد کی کس درجہ محافظ ہے اور نہ ہی لیگ اور خاکسار ایک دوسرے سے اس قدر قریب آ سکتے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اس آخری شق میں استقامت پیدا ہو جائے تو شہدائے لاہور کی قربانی رائیگاں نہ گئی[2]۔ ربنا الف بين قلوبنا واجعلنا بنعمتك اخوانا۔

یہاں تک ہم نے جو کچھ لکھا وہ اس خون کی ہولی سے متعلق تھا جو ۱۹ مارچ کو لاہور میں کھیلی گئی۔ لیکن مسلم لیگ کے اجلاس لاہور کی اہمیت صرف اسلئے نہیں کہ اس میں اس قیامت خیز سانحہ کے نتائج و عواقب کو اس حسن و خوبی سے سنبھالا گیا۔ لیگ کا یہ اجلاس فی الحقیقت مسلمانانِ ہند کی ملی زندگی میں ایک تاریخی اجلاس تھا اور ہم تو یہ کہیں گے کہ وہ خوش نصیب مسلمان جنھوں نے اس اجلاس کو بچشمِ خویش دیکھا ہے وہ محسوس کریں گے کہ انھوں نے ان چار دنوں میں ایک قوم کی پوری تاریخ کو اپنے سامنے چلتے پھرتے دیکھ لیا۔

---

[1] یعنی خود قائداعظمؒ نے

[2] افسوس کہ یہ امید موہوم ثابت ہوئی اور ایسی زندہ تحریک، محض بانی تحریک کی شوریدہ سری کے باعث تباہ و برباد ہو گئی۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک فلم تھا جس میں پہلے یہ دکھایا گیا کہ ایک قوم جب طاغوتی طاقتوں کے پنجۂ استبداد میں جکڑی ہوتی ہے تو اس پر کس قدر افسردگی چھا جاتی ہے۔ اس کے قوائے عملیہ کس قدر مضمحل ہو چکے ہیں۔ اس کا دل آرزوؤں اور ولولوں کا نشیمن ہونے کے بجائے کسقدر حزن و یاس کا کاشانہ بن جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد جب اس قوم میں ایک رہبرِ فرزانہ پیدا ہو جائے تو وہ کس طرح پوری کی پوری فضاء کو بدل کر قوم کے عروقِ مردہ میں نیا خونِ زندگی دوڑا دیتا ہے۔ مسلم لیگ کے متعلق آج تک یہ کہا جاتا تھا کہ بالآخر اس کے سامنے پروگرام کیا ہے۔ اس کی تگ و دو کا منتہیٰ کیا ہے۔ اس کے سامنے نصب العین کونسا ہے؟ لاہور کے اجلاس نے واضح اور بیّن الفاظ میں بتا دیا کہ مسلم لیگ کا نصب العین کیا ہے! ہم ایک عرصہ سے لکھتے چلے آ رہے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی گتھیوں کا حل اس کے سوائے اور کچھ نہیں کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے انھیں دوسرے حصۂ ملک سے الگ کر کے، ایک جداگانہ حکومت قائم کی جائے۔ صدر مسلم لیگ، مسٹر جناح، گذشتہ دو برس سے جس نہج سے قدم اٹھاتے چلے آ رہے تھے، دیکھنے والی آنکھیں اچھی طرح دیکھ رہی تھیں کہ ان کی منزلِ مقصود کیا ہے! حتیٰ کہ ہم نے مارچ کے پرچہ میں مسٹر جناح کی خدمت میں جو سپاسنامہ[1] پیش کیا تھا، اس میں اس منزل کا پتہ نشان بھی کھلے کھلے الفاظ میں بتا دیا تھا۔ پہلے انھوں نے اعلان کیا کہ مسلمان ایک اقلیت یا فرقہ نہیں، بلکہ ایک مستقل با لذات جداگانہ قوم ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ ہندوستان ایک واحد ملک نہیں بلکہ مجموعہ ممالک ہے۔ پھر اور آگے بڑھے تو ارشاد فرمایا کہ مغربی انداز کا نظامِ جمہوریت مسلمانانِ ہند کے نزدیک قطعاً قابلِ قبول نہیں۔ جب یوں آہستہ آہستہ زمین تیار ہو گئی۔ جب قوم نے ایک مرکب کے مختلف عناصرِ ترکیبی کو یوں الگ الگ دیکھ لیا تو اس کے بعد ۲۲ مارچ کی سہ پہر اپنے خطبۂ صدارت میں اور اس کے بعد ۲۳ مارچ کے کھلے اجلاس میں ایک رزولیوشن کے ذریعہ اس حقیقتِ ثابتہ کا اعلان کر دیا کہ مسلمانانِ ہند کا نصب العین یہ ہے کہ وہ ان علاقوں میں جہاں ان کی اکثریت ہے اپنی آزاد اور جداگانہ حکومت قائم کریں گے جہاں نہ انگریز کا عمل دخل ہو گا نہ ہندو کا اثر و تسلط۔ جب ایک واضح اور درخشندہ نصب العین سامنے آ جاتا ہے تو اس وقت قوم کے دلوں کی کیا حالت ہوتی ہے، یہ الفاظ میں نہیں سمجھایا جا سکتا۔ اس کا اندازہ تو اس پنڈال سے لگ سکتا تھا جس میں یہ اعلان کیا گیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ فی الواقع مسلمان ایک نئی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ اس اعلان نے مسلمانانِ ہند کے تصورات کی دنیا کو بدل دیا۔ ان کے احساسات میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ہندوستان میں ان کی نشاۃ ثانیہ کا سنگِ بنیاد رکھ دیا۔

بیا تا گُل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم فلک را سقف بشگافیم و طرحِ نو در اندازیم

ذرا مارچ کے طلوعِ اسلام کو اٹھائیے۔ اور "صبحِ امید" کے عنوان سے ہم نے جو کچھ لکھا تھا اُسے ایک بار پھر پڑھیے اور دیکھیے کہ حکیم الامت حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۳۰ء میں جو کچھ فرمایا تھا، کامل دس برس تک اِدھر اُدھر چکر کاٹنے کے بعد، ملتِ اسلامیہ کو وہیں آنا پڑا۔ اس کے سوا کوئی اور چارہ کار ہی نہ تھا۔ کوئی اور منزل ہی نہ تھی۔ یہ ہے فرقِ دانشِ نورانی اور دانشِ برہانی میں۔ حضرت علامہؒ نے ہر مسئلہ کا حل قرآن کریم سے طلب کیا، اور اللہ کی اس کتابِ مبین نے انھیں وہ حل بتایا جو فطرت کے قوانین

---

[1] ہم اس سپاسنامہ کو بھی شائع کر رہے ہیں۔

کی طرح اٹل اور غیر متبدل تھا۔ دنیا جہاں جی چاہے صحرا نوردی اور دشت پیمائی کرتی پھرے اسے بالآخر ہار تھک کر قرآن ہی کی طرف آنا ہوگا۔ جتنی جلدی آجائے اتنی ہی مفت کی پریشانیوں سے بچ جائے۔ اور بڑی خوشی یہ تھی کہ ملت اسلامیہ نے اپنے نصب العین کے متعلق یہ اعلان اسی مردِ حق آگاہ کے راحت کدہ کے سرہانے جا کر کیا

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد چشم خود بر بست و چشم ما کشاد

ہاں تو لیگ نے اس رزولیوشن سے مسلمانانِ ہند کے سامنے ایک نئی زندگی کا دروازہ کھول دیا۔ اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی جداگانہ حکومت کا نصب العین۔ یقیناً ایک نئی زندگی کی تمہید ہے۔ اس امر کی مخالفت اگر کہیں سے ہو سکتی تھی تو اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کی طرف سے ہو سکتی تھی۔ لیکن ان صوبوں کے مسلمان نمائندوں نے جس وسعت اور کشادگی قلب سے اس رزولیوشن کی تائید کی وہ اس امر کا آئینہ دار تھا کہ مسلمان اب کس طرح اپنے انفرادی مصالح کو ملت کے کلی مصالح پر قربان کر دینے پر بسر و چشم آمادہ ہے۔ ہم اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو ان کے اس طرزِ عمل پر در خورِ ہزار مبارکباد سمجھتے ہیں۔ اللہ انھیں خوش رکھے۔ انھوں نے فی الواقع بڑی ہمت سے کام لیا ہے۔ لیگ کے اس رزولیوشن کے بعد ہم نہیں سمجھتے کہ وہ مسلمان جو اس وقت تک لیگ کی مخالفت کرتے چلے آرہے ہیں اب کس بنا پر اس کی مخالفت جاری رکھیں گے! لیگ کا نصب العین واضح ہو گیا۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوئے اس نصب العین کی مخالفت کر سکتا ہے۔ اس وقت تک جو کچھ پریس میں آچکا ہے اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اس رزولیوشن نے ہندوؤں کو کس طرح آتش در پیرہن کر دیا ہے۔ مہا سبھائی اور کانگریسی نرم اور گرم سب بیک زبان اس کی سخت سے سخت مخالفت کر رہے ہیں۔ کیا یہی امر اس چیز کے ثبوت کے لئے کافی نہیں کہ یہ نصب العین کس طرح مسلمانوں کے مفاد کے عین مطابق ہے۔ اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ جس چیز سے شیطان ناراض ہو وہ یقیناً اللہ کی خوشنودی کا باعث ہوا کرتی ہے۔ اب صرف یہ دیکھنا باقی ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو مسلمان کہلواتے ہوئے اس باب میں غیر مسلموں کی تائید کرتے ہیں[1]۔ حق و باطل کے امتیاز کی یہ کیسی عمدہ کسوٹی ہے! آئیے اور خود امتحان کر لیجئے۔

لیکن ایک چیز ابھی لیگ سے بھی کہنی باقی ہے۔ کہنے کو تو یہ رزولیوشن چند الفاظ کا مجموعہ ہے۔ لیکن درحقیقت یہ ایک کھلا ہوا اعلانِ جنگ ہے تمام غیر مسلم قوتوں کے خلاف! لہٰذا اس امر کا خوب اندازہ کر لینا چاہئے کہ اس نصب العین کے حصول کیلئے کیا کچھ کرنا ہوگا۔ یہ حکومت و سلطنت خریدنے کا سودا ہے اور اس جنسِ گراں مایہ کی قیمت میں ایک قوم کو اپنی عزیز ترین متاع قربان کرنی پڑتی ہے۔

یہ شہادت گہہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

---

[1] تحریک پاکستان کی مخالفت، نیشنلسٹ علماء اور اسلامی جماعت نے کی تھی۔

یہ تھی وہ روئداد جو طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس سے قبل ادارۂ طلوعِ اسلام کی طرف سے قائداعظمؒ کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا تھا۔ ہم بیادِ قائداعظم مرحوم، اس سپاسنامہ کی دوبارہ اشاعت میں فخر و سعادت محسوس کرتے ہیں۔ وھوھذا۔

بہ شرفِ نظر

شیرِ بیشۂ بیباکی و حریت، ضیغمِ نیستانِ جرت و بسالت۔ شاہینِ افلاکِ تدبر و سیاست۔ پروانۂ شمعِ اخوت و حمیت۔ طرۂ کلاہِ ملک و ملت۔ بطلِ جلیلِ ہندیاں۔ قائدِ اعظمِ اسلامیاں۔ عظمت مآب۔ محترم المقام جناب محمد علی جناح۔ مدظلہ العالی۔

بتقریب سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ۔ بمقام لاہور

حریت نواز! ذرا تصور میں لائیے ایسے وقت کو کہ ایک وحشت انگیز ہولناک بیابان میں راہ گم کردہ مسافروں کا ایک بکھرا ہوا قافلہ نشانِ منزل سے مایوس ہو کر ضعفِ عزیمت سے پاشکستہ بیٹھ چکا ہو۔ ایک درماندہ راہرو کی صدائے دردناک جو آوازِ رحیل کا کام دے رہی تھی، فطرت کے اٹل قوانین کے ماتحت خاموش ہو چکی ہو۔ شام کا بھیانک سناٹا۔ سر پر منڈلانے والی شب تیرہ و تار کی ہیبت انگیزیوں کا پیام جانکاہ دے رہا ہو۔ غاروں میں چھپے ہوئے درندوں کے پاؤں کی آہٹ موت کو قریب تر لاتی نظر آ رہی ہو۔ درختوں کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے رہزنوں کی ریشہ دوانیاں دامنِ صحرا پر پھیلتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ بڑھتی چلی آ رہی ہوں۔ وہ لوگ جن کی قیادت و سیادت پر بھروسہ تھا، برادرانِ یوسف کی طرح اپنے قافلہ کی گراں بہا متاع دوسروں کے ہاتھ بیچ ڈالنے کی فکر میں ہوں۔ غرضیکہ ہلاکت یقینی اور تباہی اٹل معلوم ہوتی ہو۔ افرادِ قافلہ میں سے جن کے دلوں میں اس الم انگیز کیفیت کا احساس ہو ان کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھ رہی ہوں۔ کہ دُور۔ افقِ امید سے ایک شاہسوارِ رواں دواں۔ امیدوں کی ایک دنیا اپنے ساتھ لئے ان سوختہ سامانوں کی طرف بڑھتا چلا آئے۔ منتشر افرادِ کارواں کو پھر سے ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دے اور اپنوں اور بیگانوں کی تیار کردہ ہلاکت و بربادی کی گھاٹیوں سے بچاتا ہوا، انھیں کسی محفوظ مقام کی طرف لے جانے کی فکر کرے۔ اندازہ فرمائیے کہ جو قلبی کیفیت اس وقت ان راہ گم کردہ مسافروں کی ہوگی، وہی حالت آج ملتِ اسلامیہ (ہندیہ) کی ہے۔ تحریکِ آزادی کے آغاز میں مسلمانوں کی عمومی حالت یہ تھی کہ یہ ریت کے ذروں کی طرح بکھرے پڑے تھے کہ تیز ہوا کا جھونکا آتا اور انھیں اِدھر سے اُدھر اڑا لے جاتا، پانی کی رو آتی اور انھیں اپنے ساتھ بہا لے جاتی۔ اس کاروانِ بے سالار کی متاعِ گراں بہا کو لوٹنے کے لئے چاروں طرف سے قوتیں ہجوم کر کے آ رہی تھیں۔ غیر تو غیر، خود اپنوں کی یہ حالت تھی کہ ان کی سحر طرازیاں اور فسوں سازیاں ملتِ بیضا کو خدائے طور سینا سے ہٹا کر گوسالہ پرستی کی دعوت دیتی تھیں غرضیکہ حالت یہ تھی کہ

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو　　ترس گئے تھے کسی مردِ راہ داں کے لئے

قوم کی صحیح رہنمائی کرنے والے ایک ایک کر کے چل بسے تھے۔ بزمِ ملت کی آخری شمع جس کی ضیا پاشیوں سے لاکھوں آنکھیں پُرنور تھیں، ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو بجھ چکی تھی[1]۔ اس کس مپرسی اور بیکسی کے عالم میں اللہ تعالیٰ نے اس منتشر قافلہ کی شیرازہ بندی کے لئے آپ کی ذاتِ گرامی کو چن لیا۔ اور آپ کی نگۂ دوررس نے اس قافلے کو بتایا کہ ان کے گردوپیش کس کس قسم کی خطرناک گھاٹیاں موجود ہیں۔ وہ گھاٹیاں کہ جن میں کہیں "متحدہ قومیت" کے دامِ ہمرنگ زمین میں کبوترِ حرم کو پھانسنے کی تجویزیں ہو رہی تھیں۔ کہیں کہیں کسی منبر سے یہ آواز آ رہی تھی کہ قومیتیں مذہب سے نہیں، اوطان سے بنتی ہیں۔ اور یوں اس طائرِ لاہوتی کے بال و پر کو غبار آلودۂ ارض و بوم بنا کر امتِ رسولؐ کافۃ الناس کو جغرافیائی حدود کی آب و گل میں محبوس کیا جا رہا تھا۔ کہیں "امرھم شوریٰ بینھم" کی حامل قوم کی نگاہوں میں مخلوط انتخاب کے سراب کو آبِ حیوان بنا کر دکھایا جا رہا تھا۔ کہیں اس "اولی الامر منکم" کی مامور جماعت کے لئے غیر مسلموں کی امامت و قیادت کو عینِ دین قرار دیا جا رہا تھا۔ کہیں انگریز کے خلاف "متحدہ محاذ" کے طلسم سے کفار و مشرکین سے تولی کے جواز کے فتاویٰ شائع ہو رہے تھے۔ ایک طرف ایک مغنیٔ آتش نفس سرود گاہِ واردھا کی مستعار لے میں یہ خواب آور گیت گا رہا تھا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں[2] اس لئے اسلام کو کسی دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت نہیں۔ دوسری طرف کچھ خداوندانِ مکتب، شاہین بچوں کے لئے، اہمسا کی بازو شکن تعلیم کی اسکیمیں تیار کر رہے تھے[3]۔ ہندو اپنے ذہن میں "رام راج" کے قیام کے منصوبے باندھ رہا تھا اور اس کے لئے انگریز سے "شریفانہ معاہدے" (Gentleman's agreement) استوار کر رہا تھا۔ ہندوؤں کے شور و غوغا سے متاثر انگریز بھی مسلمانوں کو بلا تامل ہندو کے ہاتھ میں دے دینے پر آمادہ تھا کہ وہ اپنی پانچ ہزار سالہ غلامی کا جذبۂ انتقام اس کے خون سے ٹھنڈا کرے۔ جو لوگ اغیار کی صفوں میں کھڑے ہو کر ملتِ اسلام کی نمائندگی کا دعویٰ کر رہے تھے ان میں اتنا سمجھنے کی بھی استطاعت نہ تھی کہ بساطِ سیاست پر یہ آئینی مہرے کس طرح چلائے جا رہے ہیں۔ ہندو خوش تھا کہ اس نے ۹ کروڑ فرزندانِ توحید کو اچھوتوں کی صف میں ملا دیا۔ انگریز راضی تھا کہ وہ خنجرِ ہلال جس کے بے نیام ہونے کے خوف سے کلیجۂ صلیب میں ہمیشہ دھڑکن رہتی تھی اسے گنگا کی لہروں میں بہا دیا گیا کہ اس کس مپرسی کے عالم اور اس خلفشار و تشتت کے وقت آپ آگے بڑھے اور ہندوؤں اور انگریزوں کے ہر خفیہ منصوبے اور ہر پوشیدہ سازش کو ایک ایک کر کے بے نقاب کر دیا اور یوں ان کے تصورات کی حسین دنیا کو ایک خوابِ پریشاں میں تبدیل کر کے رکھ دیا اور ساری دنیا پر اس حقیقتِ عظمیٰ کو واضح کر دیا کہ

آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

بطلِ جلیل القدر!

ہمیں خوب احساس ہے کہ آپ کی منزل کس قدر کٹھن اور راستہ میں کس قدر مشکلات کا سامنا ہے۔ جہاں تک غیروں کا تعلق ہے مسلمان جیسی منتشر قوم کے مقابلہ میں ہندوستان اور برطانیہ کی دو بڑی قوتوں کا متحدہ محاذ ہی کچھ سنگِ گراں نہیں لیکن غیروں سے

---

[1] حضرتِ علامہ اقبالؒ

[2] ابوالکلام صاحب آزاد

[3] شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب۔

کہیں زیادہ مہیب اور جانگداز مشکلات خود اپنوں کی پیدا کردہ ہیں۔ ان "اپنوں" کو بھی چھوڑیئے جو محض اپنی سنہری اور روپہلی مصلحت کوشیوں کی خاطر نشرگاہ وار دھا (Radio Station) کے آلاتِ مکبر الصوت (Loud Speakers) بنے ہوئے ہیں، وہ تو اس مخالفت پر مجبور ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ ماتم تو ان "مخلص منافقین" کا ہے جن کی رفاقت و حمایت بیش ازیں نیست کہ

کافر نتوانی شد ۔ ناچار مسلماں شو

جن کا مقصد وحید اپنے طرۂ وجاہت کا قیام و بقا ہے۔ خواہ یہ آستانۂ خواجۂ یثرب سے وابستگی ظاہر کرنے سے حاصل ہو جائے یا لشکر بولہبی میں شمولیت سے۔ بایں ہمہ نہ ان غیروں کا ہجوم مخالفت ایسا ہے کہ اس سے خوف کھایا جائے اور نہ اپنوں میں سے بعض کی نوازشہائے بیجا اور دوسروں کے طعنہ ہائے دلخراش ایسے کہ ان کا غم کھایا جائے۔ کہ جو حق پر ہو اسے کسی کی مخالفت کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے۔

رہے ہیں اور ہیں فرعون تیری گھات میں اب تک،
مگر کیا غم کہ تیری آستیں میں ہے یدِ بیضا

حریت مآب!

ہمیں اس بات کا بھی علم ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ تگ و دوِ حیات میں جو نصب العین آپ کے سامنے ہے، وہ وہی ہے جو ہر مسلمان کی نگاہوں کے سامنے ہونا چاہیئے جس کے دل میں بہ حیثیت مسلمان زندہ رہنے کی تڑپ اور اپنی نسلوں کو بہ حیثیت مسلمان رکھنے کی آرزو موجزن ہے اور کسے معلوم نہیں کہ وہ نصب العین ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند (Muslim India) کی تشکیل کے سوا اور کچھ نہیں۔ جس طرح آپ احوال و ظروف کا صحیح جائزہ لیتے ہوئے قدم بقدم اس درخشندہ نصب العین کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں، وہ آپ کی بلند نگہی اور حسن تدبر کا آئینہ دار ہے۔ سطح بیں لوگوں نے آپ کو صرف ایک فاضل مقنن اور دیدہ ور مدبر کی حیثیت سے ہی پہچانا۔ لیکن جن لوگوں کو آپ کے قریب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ مبدءِ فیض نے آپ کو اس قدر ذہن رسا کے ساتھ ساتھ کس قدر دلِ پرسوز و پردرد کی نعمتوں سے نوازا ہے۔

خرد نے تجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ سکھائی عشق نے تجھ کو حدیث رندانہ

اور قلب و نظر اور عقل و عشق کا یہی امتزاج ہے جو ایک ناخدائے کشتیٔ ملت کی متاع گراں بہا ہے۔

نگہ بلند ۔ سخن دلنواز ۔ جاں پرسوز یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کیلئے

عالیمرتبت!

آپ یقین فرمایئے کہ جس قوم کی فلاح و بہبود آپ کی زندگی کا منتہیٰ ہے، اس کا سوادِ اعظم آپ کی قیادت و امارت پہ کامل بھروسہ رکھتا ہے۔ اور ان کی خاطر آپ نے جو گرامی قدر قربانیاں کی ہیں ان کے دل میں پورا پورا احساس ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ سرزمینِ پنجاب جو ملتِ اسلامیہ کے اس اجتماعِ عظیم کی تقریب پر آپ کی تشریف آوری سے سرفراز ہونے والی ہے اس میں آئینی نقطۂ نگاہ سے (Constitutionally) ابھی پراونشل لیگ کا قیام بھی عمل میں نہیں آسکا۔ لیکن ہمیں امید ہے

کہ یہ حقیقت آپ کی نگاہ سے مستور نہ ہوگی کہ پنجاب کا ایک ایک قریہ اور اس قریہ کے ایک ایک فرد کا دل آپ کی عظمت وعقیدت کا نشیمن بنا ہوا ہے۔ بس کسی ایک مرد خود آگاہ و خدا دوست کے نعرۂ مستانہ کی دیر ہے۔ یہ طوفان بلا انگیز کسی کے روکے نہیں رُکے گا اس وقت بچے گا وہی جو کشتیٔ ملت میں اخلاص و دیانت سے سوار ہوگا اور پکارنے والا پکارے گا کہ

لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ

سیّد القوم!

ادارۂ طلوعِ اسلام، جسے ہزارہا پرخلوص اور صحیح النظر مسلمانوں کی ترجمانی کا فخر حاصل ہے۔ اجلاس لیگ کی صدارت پر آپ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتا ہے اور مستدعی ہے کہ جس نصب العین کی طرف آپ کا قدم اٹھ رہا ہے قوم کو اس کی طرف اور تیز گامی سے بڑھائے جائیے۔ اس نصب العین کے حصول کے لئے اگر ضرورت پیش آئی تو آپ دیکھیں گے کہ قوم کس طرح کفن بدوش و سر بکف آپ کی دعوت پر لبیک کہتی ہے۔

بانشۂ درویشی درساز و دما دم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

اراکین ادارۂ طلوعِ اسلام

تاریخِ رسالت

(معارف القرآن جلد سوم)

رسولِ کریمؐ سے پیشتر کے انبیائے کرام کی دعواتِ انقلاب کا تذکرہ قرآن کی روشنی میں

مصنفہ جناب پرویز صاحب

قیمت: پندرہ روپے علاوہ محصول ڈاک

نیز

معراجِ انسانیت

(معارف القرآن جلد چہارم)

رسول کریم صلعم کی سیرۃ پر اپنی قسم کی واحد کتاب

مصنفہ جناب پرویز صاحب —— قیمت بیس روپے

ملنے کا پتہ: ادارۂ طلوع اسلام۔ رابسن روڈ۔ کراچی

ہمارا ہمسایہ

طلوع اسلام بابت جولائی ۱۹۴۸ء میں حسب ذیل لمعات لکھے گئے تھے۔

ہندوؤں نے سومنات کی جامع مسجد کو، جسے ۱۰۲۴ء میں سلطان محمود غزنویؒ نے تعمیر کرایا تھا زبردستی مندر میں تبدیل کر لیا ہے۔
اس موقعہ پر ہندوؤں نے بہت بڑا جشن منایا جس میں پولیس اور فوج نے بھی شرکت کی۔ مسجد کے ۵، سالہ بوڑھے متولی کو باہر نکال دیا گیا۔
اور خدا کے اس گھر میں بُت رکھ دیئے گئے۔ اب مسجد میں ناقوس بجتا ہے اور بتوں کی پوجا ہوتی ہے۔ (ڈان ۱۳ جون ۱۹۴۸ء)

یہ ایک مثال ہے استبداد و قہر مانیت کی، ان سینکڑوں مثالوں میں سے جو ہندوستان کی مزعومہ جمہوری حکومت، باایں ہمہ ادعائے حریت فکر و نظر اور آزادیٔ مذہب و مسلک، ہندوستان کے چار کروڑ مسلمانوں پر بلا دریغ و بے محابا روا رکھ رہی ہے۔ ایک مساجد و معابد کا کیا ذکر، کونسی شے ہے جو مسلمانوں کے نزدیک محبوب و محترم ہے اور اسے وہاں محفوظ و مصئون سمجھا جا سکتا ہے۔ جان، مال، عزت، آبرو، عصمت، ناموس، سب ان کے رحم و کرم پر ہے جنہیں

خبر نہیں روشِ بندہ پروری کیا ہے ؟

یہی وہ "فساد ملوکیت" ہے جس کی طرف قرآن کریم نے ان بلیغ الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے کہ ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا وجعلوا اعزۃ اھلھا اذلۃ وکذالک یفعلون (۲۷/۳۴) جب کسی ایسی قوم کو حکومت مل جاتی ہے جو نشۂ ملوکیت سے بدمست ہو تو وہ عدل و انصاف کی تمام راہوں کو الٹ دیتی ہے۔ اور عزت و شرافت کے پیکروں کو ذلیل و خوار کرنے میں لذت لیتی ہے وکذالک یفعلون۔ یعنی یہ کسی ہنگامی واقعہ کی طرف اشارہ نہیں جو زمنۂ قدیمہ میں کبھی گذر چکا ہو۔ بلکہ یہ خاصۂ ملوکیت ہے۔ یہ قوت بے زمام کی فطرت ہے۔ ملوکیت ہمیشہ یہی کرتی چلی آئی ہے اور یہی کرتی چلی جائے گی۔ وکذالک یفعلون۔ اور جب حکومت و سطوت کسی ایسی قوم کو مل جائے جو ہمیشہ غلام رہی ہو تو ان کی کم ظرفی اور تنگ نگہی، جور و استبداد کے خنجر عریاں کے ساتھ بدفطرتی اور سفلگی کی جراحت پنہاں بھی شامل کر دیتی ہے اور ان کی ہوس خون آشامی اور انتقام جوئی سسک سسک کر مرنے والوں کا تماشا دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ مصیبت عظمیٰ اور نائبۂ کبریٰ جس میں آج ہندوستان کا مسلمان گرفتار ہے۔

وہ مسلمان جو تقسیم ہند کی مخالفت کیا کرتے تھے اس چیز کو اپنے مسلک کے حق بجانب ہونے کیلئے بطور دلیل پیش کرتے ہیں اور خوش ہیں کہ انھیں یہ دلیل مل گئی۔ بعض سادہ لوح مسلمان ان کی اس نگہ فریب دلیل سے متاثر بھی ہو جاتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں کہ تقسیم ہند (یا تشکیل پاکستان) فی الواقعہ ایک غلط قدم تھا۔ لیکن سوچئے کہ کیا حقیقت یہی ہے! تقسیم ہند سے پہلے جن جن امور میں ہندوؤں کو دست غالب حاصل تھا، ذرا غور کیجئے کہ ان میں مسلمانوں کے ساتھ کیا گذرا کرتی تھی! ملازمت، تجارت، صنعت و حرفت، یا اس سے آگے بڑھئے تو

بلدیات یا ڈسٹرکٹ بورڈ۔ اور آگے بڑھئے تو ہندو فرمانرواؤں کی ریاستیں۔ ذرا سوچئے کہ ان تمام شعبوں اور دائروں میں مسلمانوں کا کسقدر حصہ ہوا کرتا تھا۔ اور ابھی وہاں انگریز کا راج تھا۔ یہ غلط ہے کہ تقسیم ہند کے بعد چونکہ وہاں مسلمانوں کی تعداد نسبتاً کم رہ گئی ہے اس لئے ہندو دلیر ہو گیا ہے۔ تعداد کا سوال ہی نہیں۔ کیا نو دس کروڑ اور کیا چار پانچ کروڑ۔ یہ بہر حال اقلیت میں تھے۔ اصل چیز ہندو کی ذہنیت ہے۔ انگریز کے راج میں وہ دبے پاؤں چلا کرتی تھی۔ اب کھلے بندوں سامنے آ رہی ہے۔ اگر مسلمان دس کروڑ بھی ہوتے تو بھی ہندو کی خوئے مخاصمت و معاندت میں کوئی فرق نہ آتا۔ آج بھی دیکھئے مثلاً یو پی۔ بہار۔ بمبئی وغیرہ میں قریب قریب اتنے ہی مسلمان ہیں جتنے تقسیم ہند سے پہلے تھے۔ لیکن ان کی یہ تعداد ہندوؤں کی چیرہ دستیوں اور ستم کوشیوں پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہو رہی۔ اس لئے یہ کہنا سرتاسر ابلہ فریبی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر جو کچھ بیت رہی ہے اس کی ذمہ دار تقسیم ہند ہے۔

اب دوسری طرف آئیے۔ اگر ہندوستان کی تقسیم نہ ہوتی تو دس کروڑ مسلمانوں پر وہی کچھ ہوتا جو آج وہاں چار کروڑ مسلمانوں پر ہو رہا ہے۔ اس تقسیم سے کم از کم پانچ چھ کروڑ مسلمان تو ان کی دراز دستیوں اور تطاول انگیزیوں سے بچ گئے۔ صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ ان کی دراز دستیوں سے بچ گئے، بلکہ رزق اور قوت کے ان تمام سرچشموں کے مالک بن گئے جو اس سے پہلے ہندوؤں کی واحد اجارہ داری میں تھے۔ پاکستانی علاقہ کی تمام تجارت، صنعت و حرفت، کاروبار، ذرائع پیداوار اور اسباب مواصلات۔ سب کے سب مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں۔ کیا متحدہ ہند میں کوئی مسلمان اس کا خواب بھی دیکھ سکتا تھا؟ اس وقت مسلمان کے حصہ میں حمالی تھی یا بقالی۔ وہاں کوئی میدان ایسا نہ تھا جس میں مسلمان ہندو کا مقابلہ کر سکتا۔ اب یہاں کوئی میدان ایسا نہیں جس میں اس کے راستہ میں ہندو حائل ہو۔ کیا یہ خدا کا کم انعام ہے؟ واورثکم ارضھم ودیارھم واموالھم . . . . وکان اللہ علیٰ کل شئ قدیر۔ (۲۷-۳۳) کہ اس نے تمہیں ان کی زمینوں کا اور شہروں کا اور مال و متاع کا مالک بنا دیا۔ اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

جو لوگ آج یہ کہتے ہیں کہ تقسیم ہند سے تمام مصیبتیں آ گئیں یاد رکھو وہ تمہارے بدترین دشمن ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا یہ انعام تم سے چھن جائے اور تم پھر انہی تنگ نظر، گوسالہ پرست، ہندوؤں کے غلام بن جاؤ۔ وانہ لکم عدو مبین۔ ہندوستان کے مظلوم و مقہور مسلمانوں کے مصائب و نوائب کا یہ حل نہیں کہ چھ کروڑ آزاد مسلمان بھی ان کے ساتھ جا ملیں اور انہی مصیبتوں میں مبتلا ہو جائیں۔ اگر آپ کا ایک بھائی جیلخانہ میں ہے تو کیا اس کی مشکلات کا مداوا اس سے ہوتا ہے کہ آپ بھی اس کے ساتھ جیل خانہ کی کوٹھڑی میں بند ہو جائیں۔ حل یا اس کا کچھ اور ہوتا ہے۔

ذرا سوچئے کہ ہندو آج اس قدر اوچھا کیوں ہو رہا ہے؟ جو کچھ اس نے مشرقی پنجاب، دہلی، الور، گوالیار وغیرہ کے مسلمانوں کے ساتھ کیا۔ جو روش اس نے جونا گڑھ، کشمیر اور آج حیدر آباد کے معاملہ میں اختیار کر رکھی ہے اور جن مشئومہ عزائم کی بعض جھلکیاں ان کے اکابرین کے جوش غیظ و غضب میں ان کی کف دہانی کے ساتھ دنیا کے سامنے آ جاتی ہیں، اس کا اصل سبب کیا ہے؟ آپ غور سے دیکھیں گے تو ان تمام بے انصافیوں اور دست درازیوں کی علت یہ نظر آئے گی کہ ہندوؤں نے یہ خیال کر لیا ہے کہ پاکستان کا مسلمان کمزور ہو چکا ہے۔ بس یہ ایک زعم باطل ہے جس میں ہندوؤں کے اس تمام اوچھے پن کا راز پوشیدہ ہے۔ کم ظرف انسان جب یہ یقین کر لے کہ اس کا فریق مقابل کمزور ہے تو اس کی دنائت و سفالت انتہائی سفاکی اور قصابی میں بدل جایا کرتی ہے۔ یہ ایک محکم اصول ہے جس کا جس جگہ چاہے مطالعہ کر لیجئے۔

یہی اصول آج ہندو کی بیجا تلاطم خیزیوں کی تہ میں کارفرما ہے۔ مغربی پنجاب میں ہندوؤں کے ہاں ایک مثل تھی کہ "مسلے نوں ٹرخائیے۔ ٹرخ جائے تے ٹرخ جائے۔ نہیں تے آپ ٹرخ جائیے"۔ مسلمانوں کو گیدڑ بھبکی دیجئے اگر وہ اس کے رعب میں آجائے تو خوب۔ ورنہ خود دب جائیے۔ آج ہندوستان کا ہندو اپنی قوت کے نشہ کے زعمِ باطل میں مسلمانوں کو اسی قسم کی بھبکیاں دے رہا ہے۔ اگر مسلمان نے اپنے دل میں سمجھ لیا ہے کہ وہ واقعی کمزور ہو چکا ہے تو ہندو کی بھبکیاں فی الواقعہ کارگر ہو جائیں گی۔ اور اگر اس کا اس پر ایمان ہے کہ

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم!

تو یقین مانئے۔ ہندو اس ضیغم نیستانی کی ایک دھاڑ کو بھی برداشت نہیں کر سکے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ آج مصافِ زندگی میں سپاہ اور اسلحہ بڑی چیز ہے۔ لیکن یاد رکھئے! قوموں کی قوت کا راز ان کی سپاہ اور اسلحہ کی فراوانی میں نہیں ہوتا۔ یہ راز ان کے عزم و ثبات اور ایمان و یقین میں پنہاں ہوتا ہے۔ یقین کی قوت، دنیا کی ہر قوت پر غالب ہوتی ہے۔ یہی وہ قوت ہے جس کی بنا پر تاریخ کی آنکھوں نے یہ تماشے بھی دیکھے ہیں کہ کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ (۲/۲۴۹) کتنی ہی چھوٹی چھوٹی جماعتیں تھیں جو بڑی بڑی جماعتوں پر اللہ کے قانون کے ماتحت غالب آگئیں۔ وہ قانونِ خداوندی کیا ہے؟ واللہ مع الصابرین (۲/۲۴۹) یہی کہ اللہ کی نصرت عزم و ثبات کا ساتھ دیتی ہے۔ یقین کی قوتیں مادی قوتوں کی کمی کو بھی پورا کر دیتی ہے۔

مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی!

اگر اس پر شہادت کی ضرورت ہے تو پوچھئے بدر و حنین کے ذرات سے جنہوں نے مومنین کو بے تیغ لڑتے اور فاتح و منصور لوٹتے دیکھا ہے۔ یقین کی قوت، فریقِ مقابل کے سپاہ و اسلحہ کو تو خاطر ہی میں نہیں لاتی ان کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

الذین قال لہم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوہم فزادہم ایمانا وقالوا حسبنا اللہ ونعم الوکیل ۰ (۳/۱۷۲)

یہ وہ لوگ ہیں جن سے بعض آدمی کہتے تھے کہ تم سے جنگ کرنے کیلئے دشمن نے بہت بڑا لشکر اکٹھا کر رکھا ہے۔ سو تم ان سے ڈرو (اور مقابلہ کے لئے نہ نکلو) لیکن (یہ بات سن کر بجائے اس کے کہ وہ ڈر جاتے) ان کا ایمان اور مضبوط ہو گیا۔ اور وہ (بے خوف و خطر) پکار اٹھے کہ ہمارے لئے اللہ کا سہارا بس کرتا ہے۔ اور جس کا کارساز اللہ ہو تو کیا ہی اچھا اس کا کارساز ہے۔

اور اس کا نتیجہ

فانقلبوا بنعمۃ من اللہ وفضل لم یمسسہم سوء واتبعوا رضوان اللہ۔

یہ لوگ (مقابلہ کے لئے نکلے اور) اللہ کی نعمت اور فضل سے شاد کام واپس لوٹے۔ کوئی گزند انہیں چھو نہ سکا۔ اور وہ اللہ کی خوشنودیوں کی راہ میں گامزن ہوئے۔

مسلمان کسی پر زیادتی نہیں کر سکتا۔ وہ خواہ مخواہ جنگ کی آگ کو مشتعل نہیں کرتا۔ وہ دنیا میں امن و سلامتی چاہتا ہے۔ لیکن کسی کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ امن کو خراب کرے اور خدا کی مخلوق کو ستائے۔ ہندو نے گذشتہ دس ماہ کے عرصہ میں دنیا پر روشن کر دیا ہے کہ وہ کس قدر امن و سلامتی کا دشمن اور ظلم و فساد کا رسیا ہے۔ اور اس کی علت جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے، صرف یہ ہے کہ وہ سمجھے بیٹھا ہے کہ

پاکستان کا مسلمان کمزور ہے۔ لہٰذا ہندو کے دماغی خلل کا علاج یہ ہے کہ اس کے دل سے یہ زعم باطل نکال دیا جائے کہ مسلمان کمزور ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ مسلمان اس کا عزم کرلے کہ جو آنکھ اس کی طرف بری نیت سے دیکھے گی وہ آنکھ نکال لی جائے گی۔ خواہ وہ کسی سر میں کیوں نہ ہو۔ اگر ہندوؤں نے کسی سمت سے بھی اپنے قدم بڑھائے تو مسلمانوں کی طرف سے اس کا جواب وہی ہونا چاہیئے جو ابدالی کی تلواروں نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو دیا تھا۔ یاد رکھئے! اگر ہندو کو ایک شکست مل گئی تو پھر یہ خود بھی امن سے رہے گا اور دنیا کا امن بھی بحال ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد ہندوستان کے چار کروڑ مسلمان بھی عزت و آبرو کی زندگی بسر کرسکیں گے۔ پھر سن رکھئے! کہ اس کیلئے فوج اور اسلحہ پر ہی بھروسہ کئے نہ بیٹھے رہئے۔ جب تک پوری کی پوری قوم عزم و ثبات سے مقابلہ نہ کرے، فوج اور اسلحہ کچھ نہیں کرسکتا۔ پاکستان کی قوت کا راز مسلمانوں کے عزم و ثبات میں ہے۔ جو تمہیں یہ کہتا ہے کہ تم کمزور ہو، وہ ملت کا بدترین دشمن ہے انما ذالکم الشیطان یخوف اولیاءہ فلا تخافوا ھم وخافون ان کنتم مومنین ۰ (۳/۱۷۵) "یہ شیطان ہے جو تمہیں اپنے ساتھیوں سے ڈرانا چاہتا ہے۔ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو شیطان کے ساتھیوں سے نہ ڈرو۔ اللہ سے ڈرو" تمہیں سال گذشتہ کی قیامتِ صغریٰ سے اس حقیقت کا خود تجربہ ہو چکا ہے کہ مرتا وہ ہے جو موت سے بھاگتا ہے۔ جو موت کے سامنے کھڑا ہو جائے موت اس سے خود خوف کھاتی ہے۔

یہ درست ہے کہ ہمارے اکابرین ہماری ان توقعات پر پورے نہیں اتر رہے جو ہم نے ان سے وابستہ کی تھیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ ہماری حکومت کی مشینری میں بہت سے نقائص ہیں لیکن یہ چیزیں قطعاً اس کا جواز نہیں بن سکتیں کہ آپ پاکستان کے استحکام کی طرف سے بے فکر ہو جائیں۔ پاکستان، تمام ملت اسلامیہ کی مشترکہ امانت ہے۔ ہمارے اکابر و اعیان اس امانت کے واحد مالک نہیں کہ اس کے ضائع ہونے میں صرف ان ہی کا نقصان ہو گا۔ ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ یہ تو وہ آگ ہو گی جس کے شعلوں سے نہ خواص ہی بچ سکیں گے نہ عوام۔ واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ ۵ واعلموا ان اللہ شدید العقاب (۸/۲۵) "اس عظیم فتنہ سے اپنا بچاؤ کرلو جو صرف ان ہی تک محدود نہیں رہے گا جو تم میں سے زیادتی کرنے والے ہیں۔ یاد رکھو۔ اللہ کا قانونِ مکافات بڑا سخت گیر ہے" لہٰذا اپنے کارکنانِ حکومت کی خامکاریوں کی طرف نہ جاؤ۔ ان بدنظمیوں کی وجہ سے پیدا شدہ پریشاں حالیوں کی طرف نہ جاؤ۔ اپنے سامنے پاکستان کا استحکام رکھو کہ پاکستان کی بقا خود تمہاری اپنی بقا ہے۔

غیر ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے، جام رہے۔

موجودہ "فنون جنگ" میں دشمن کا سب سے بڑا حربہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فریق مقابل میں خوف و ہراس پھیلا دیتا ہے۔ تاکہ ان میں انتشار و اختلال پیدا ہو جائے۔ امن کے زمانے میں اس قسم کی وحشت انگیزی اور دہشت افشانی سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ قوم مخالف کے عزم و ثبات کا جائزہ لیا جائے۔ [گذشتہ ایام "۱۵ر جون" کا ہوا اسی قسم کا مقیاس (Feeler) تھا جو مسلمانانِ پنجاب کی ہمت آزمائی اور حوصلہ پیمائی کے لئے ہندوؤں کی طرف سے فضا میں پھینکا گیا تھا۔] اس تخویف و ترہیب کا جواب جمعیتِ خاطر اور سکونِ دماغ ہے۔ اگر ہم نے اس قسم کی وحشت انگیز خبروں کو سن کر بھاگنا شروع کردیا تو یاد رکھئے یہ خواہ مخواہ دشمن کو حملہ کی دعوت دینا ہے۔ جب کبھی اس قسم کی دہشت انگیز

افواہیں پھیلیں ان کے پیچھے یونہی نہیں لگ جانا چاہئے بلکہ ان کی تحقیق کر لینی چاہئے۔ ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا قوما بجھالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین۔ (۴۹/۶) جب کوئی فتنہ جُو تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو ہمیشہ اس خبر کی تحقیق کر لیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ بے خبری میں تم قوم کو نقصان پہنچا دو اور پھر اپنے کئے پر نادم ہونا پڑے۔" خبروں کی تحقیق بھی انفرادی طور پر نہیں ہونی چاہئے بلکہ ایسے امور کیلئے حکومت کی طرف مراجعت کرنی چاہئے۔ سورۂ نساء میں ہے:۔

وَاِذَا جَآءَھُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِہٖ ۭ وَلَوْ رَدُّوْہُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْھُمْ لَعَلِمَہُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ (۴/۸۳)

جب کوئی امن یا خوف کی بات ان تک پہنچتی ہے تو اُسے خوب پھیلاتے ہیں۔ وہ اگر ایسی خبر کو رسول کی طرف یا ان لوگوں کی طرف جو ان میں صاحب اختیار ہیں، لوٹاتے تو جو ان میں بات کی تہ تک پہنچتے ہیں، وہ اس کی حقیقت کی پرکھ کر لیتے۔

لہٰذا جب کبھی کوئی ایسی خبر پھیلے تو اسے اربابِ حکومت کی طرف منتقل کر دینا چاہئے تاکہ وہ اس کی تحقیق کر لیں۔ اور اگر یہ خبر صحیح نکلے تو پھر تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اس مقصدِ وحید کیلئے آہنی دیوار کی طرح جم کر کھڑے ہو جاؤ، اور کوئی حرکت ایسی نہ کرو جس سے تمہاری ہوا اکھڑ جائے۔ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم (۸/۴۶) ایسے میں ایک دوسرے سے جھگڑا مت کرو ورنہ تم پست ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ واصبروا (۸/۴۶) ثابت قدم رکھو کہ ان اللہ مع الصابرین۔ اللہ کی نصرت ثبات و استقلال سے مشروط ہوتی ہے۔ اور پھر جب دشمن کا مقابلہ ہو تو فاثبتوا واذکروا اللہ کثیرا لعلکم تفلحون (۸/۴۵) قدم جما کر سامنے آجاؤ اور ہر وقت اللہ کی نصرت کو سامنے رکھو اور اس کی یاد دل میں۔ یہی کامیابی کا راز ہے۔ ولا تولوھم الادبار (۸/۱۵) دشمن کو پیٹھ دکھا کر نہ بھاگ کھڑے ہو۔ یاد رکھو۔ اگر تم کسی ایسے وقت پھر اسی طرح بھاگ اٹھے جس طرح پچھلے سال مشرقی پنجاب وغیرہ میں تم نے کیا تھا، تو جس بے عزتی اور بے حرمتی سے وہاں سے نکالے گئے تھے (خالم بدہن) اس سے بدتر حالت میں یہاں سے نکالے جاؤ گے۔ اور سچ پوچھئے تو اب تو کہیں نکل بھاگنے کا راستہ ہی نہیں۔ اس لئے اب عزم و ثبات سے کھڑے ہونا سیکھو۔ اللہ کی موہبت نے تمہیں بڑی فراواں قوتوں کا مالک بنا دیا ہے۔ مسلمان جیسا سپاہی دنیا کی کوئی اور قوم پیدا نہیں کر سکی۔ پاکستان کے ذرائع پیدائش اتنے وسیع ہیں کہ ساری دنیا تمہاری محتاج ہوگی اور تم دنیا میں کسی کے محتاج نہیں ہو گے۔ آج بھی دنیا کے بازارِ بیع و شری میں تمہاری ساکھ بہت بڑی ہے۔ تم جم کر کھڑے ہو گئے تو اس ستون کے سہارے پورے عالم اسلامی کی عمارت کھڑی ہو جائے گی۔ کیا تم نے اس بچے کی بات نہیں سنی جو کوفہ کے بازار میں جا رہا تھا۔ بارش سے بازار میں کیچڑ ہو رہی تھی اور بچہ تیزی سے چل رہا تھا۔ پیچھے پیچھے امام اعظمؒ آرہے تھے۔ انھوں نے کہا۔ بیٹا سنبھل کر چلو۔ پاؤں پھسلا تو گر جاؤ گے۔ بچے نے مڑ کر دیکھا تو عرض کیا۔ حضور! میری فکر نہ کیجئے۔ اپنا پاؤں سنبھالئے۔ میں پھسلا تو تنہا میں ہی گروں گا۔ اگر خدانخواستہ آپ پھسل گئے تو سارا عالم اسلامی نیچے آگرے گا۔ پاکستان کے مسلمانو! عالم اسلامی میں آج تمہارا مقام، مقامِ اعظم ہے۔ تمہارے سنبھلنے سے عالم اسلامی سنبھل جائے گا۔ اور تمہارے پھسلنے سے ساری اسلامی دنیا پھسل جائے گی۔ صرف اسلامی دنیا ہی نہیں بلکہ اس سے بھی کچھ آگے۔ یہ خطۂ ارض، قرآنی نظام کے احیاء و ترویج کی تجربہ گاہ بننے کیلئے

نہیں دیا گیا ہے۔ سوچو کہ اگر تم نے ہمت ہاری تو نوع انسانی خدا کی کتنی عظیم القدر نعمتوں سے محروم رہ جائے گی اور پھر ان کی تمام ظلمت کاریوں کی ذمہ داری کس پر عائد ہوگی!

بے خبر تو جوہر آئینۂ ایام ہے تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اللہ نے تمہیں نوع انسانی کی امامت کے لئے منتخب کیا ہے۔ اجتباء و اصطفاء کا یہ مقام ہر کسی کے حصہ میں نہیں آتا۔ واذکروا نعمۃ اللہ علیکم۔ اللہ کے انعامات و احسانات کو سامنے رکھو اور پھر سوچو کہ تمہارا فریضہ زندگی اور نصب العین حیات کیا ہونا چاہئے۔ اللہ تمہیں اس مقام بلند پر لیجانا چاہتا ہے لیکن اگر تم ان ہندوؤں کے سامنے جھک گئے جو خود پتھروں اور حیوانوں کے سامنے جھکتے ہیں، تو سمجھ لو کہ دنیائے انسانیت میں یہ کتنی بڑی گراوٹ ہوگی۔ حکومت جو کچھ اس ضمن میں کر رہی ہے وہ اس کی ذمہ داری ہے۔ لیکن تم خود اپنے اپنے طور پر اپنی اپنی جگہ منظم ہو جاؤ۔ گاؤں گاؤں، قریہ قریہ، شہر شہر، محلہ محلہ، اپنی تنظیم کرتے جاؤ۔ بس ایک مقصد کے لئے اور وہ مقصد ہے استحکام پاکستان، تاکہ اس میں خدا کی حکومت قائم ہو سکے۔ بیس آدمی جمع ہو جاؤ اور اپنے میں سے ایک سرکردہ منتخب کر لیں اور اس طرح سے یہ سلسلۂ دراز ہمہ گیر ہوتا چلا جائے۔ تقوموا للہ مثنیٰ وفرادیٰ ثم تتفکروا۔ (۳۴/۴۶) اللہ کے لئے ایک ایک دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ پھر سوچو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ بس یہ ہے حقیقی کامیابی کا راز!

اور اگر تم نے یہ نہ کیا تو پھر سارا پاکستان اسی طرح سے بت کدہ بن جائے گا جس طرح سومنات کی مسجد بت خانہ بنا دی گئی۔ ویالیت مت قبل ھذا وکنت نسیاً منسیاً۔

یہ تھے وہ "لمعات" جو طلوع اسلام بابت جولائی ۱۹۴۸ء میں لکھے گئے تھے ان الفاظ کو لکھے آج تین سال کا عرصہ گذر گیا۔ اس تین سال کے عرصے میں ہمارے ہمسائے (حکومت ہند) نے جس انداز سے حق ہمسائگی ادا کیا ہے وہ صرف ہمارے لئے ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے آئینۂ عبرت ہے۔ ہمارے اندرونی نظم و نسق میں کتنی ہی خامیاں اور خرابیاں کیوں نہ ہوں، یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں تک ہندوستان کے ساتھ ہمارے تعلقات کا واسطہ ہے ہم نے آج تک کوئی اقدام ایسا نہیں کیا جو کسی شریف انسان کیلئے وجہ شکایت بن سکے۔ لیکن تجربے نے یہ بتا دیا ہے کہ شرافت کے سلوک کے مستحق صرف شریف انسان ہوا کرتے ہیں۔ بابداں نیکی کردن چناں است کہ بانیکاں بدی کردن۔ ہندوستان ہماری شرافت کو ہماری کمزوری پر محمول کر رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ آئین و اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر ان حربوں پر اتر رہا ہے جو دنیائے عدل و انسانیت میں تو ایک طرف مغربی سیاست کے میزان میں بھی بین المملکتی ضوابط کے خلاف سمجھے جاتے ہیں۔ ان چار سالہ واقعات پر غور کرو جو تقسیم ہند کے بعد (بلکہ اس سے بھی پہلے سے) آجتک ظہور میں آتے ہیں اور پھر سوچو کہ بدعہدی اور بدمعاملگی فریب کاری اور بددیانتی کا وہ کونسا حربہ ہے جو ہندوؤں نے پاکستان کے خلاف استعمال نہیں کیا۔ ممکن ہے بعض لوگوں کو اس پر تعجب ہو کہ بالآخر یہ پوری قوم اس قسم کی عہد شکن اور فریب کار کیوں ہے؟ لیکن ارباب علم کے لئے اس کی وجہ معلوم کر لینا چنداں دشوار نہیں۔ قوموں کا کیریکٹر غیر شعوری طور پر ان کی روایات سے مرتب ہوتا ہے۔ مغربی سیاست میں آپ نے میکیاولی کا نام سنا ہوگا۔ وہی جس کا یہ مقولہ

مشہور ہے کہ "اپنے مقصد کے حصول کے لئے جو حربہ استعمال کیا جائے وہ جائز ہے"۔ اس نے اپنی مشہور کتاب (The Prince) میں بتایا ہے کہ ایک کامیاب حکمراں کی خصوصیات کیا ہونی چاہئیں۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے کہ

> بادشاہ کے لئے لومڑی کا سا مکار ہونا نہایت ضروری ہے تاکہ وہ فریب کاریوں کے جال بچھا سکے۔ اس کے ساتھ ہی اس میں شیر کی سی درندگی بھی ضروری ہے تاکہ وہ بھیڑیوں کو خوف زدہ رکھ سکے۔ صرف شیر کی سی قوت ہی کافی نہیں۔ اس لئے عقلمند حکمراں وہ ہے کہ جب دیکھے کہ کوئی معاہدہ اس کی مصلحت کے خلاف جاتا ہے یا جن مصالح کے پیش نظر وہ معاہدہ کیا گیا تھا وہ اب باقی نہیں رہے تو اس معاہدہ کو بلا توقف توڑ ڈالے لیکن یہ ضروری ہے کہ اس عہد شکنی کیلئے نگاہ فریب دلائل تلاش کرے۔

یہ ہے مغرب کا میکیاولی۔ ہندوستان کی تاریخِ سیاست میں صرف ایک مدبر کا نام ملتا ہے جو کوٹلیا (Kautilya) کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ نرائن چندر بھانڈوپادیا نے اس کی کتاب ارتھ شاستر کا ترجمہ کیا ہے۔ وہ اس کے مقدمے میں لکھتا ہے کہ کوٹلیا کے معنی "فریب کار" ہیں اور یہ لقب اس نے خود اختیار کیا تھا۔ (Spalding.) نے اپنی کتاب Civilisation in East and west میں کوٹلیا کے اصولِ سیاست کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ وہ اسے "ہندوستان کا میکیاولی" کہہ کر پکارتا ہے کیونکہ اس کے اصولِ سیاست سب میکیاولی کے سے ہیں۔ وہ بھی عہد و معاہدہ کو وقتی مصالح کے حصول کا ذریعہ قرار دیتا ہے اور معاہدہ سے بلا توقف پھر جانے کی تلقین کرتا ہے۔ ہندوؤں کی ساری تاریخ میں کوٹلیا ہی کے اصولِ سیاست، چراغِ راہ تصور کئے جاتے ہیں۔ یہ ہیں وہ اصول جن پر ہندو سیاست کی بنیاد ہے اور یہ ہیں وہ روایات جن سے ان کا قومی کیریکٹر مرتب ہوا ہے۔ اس قسم کے کیریکٹر سے بددیانتی اور بدمعاملگی، عہد شکنی اور فریب کاری کے علاوہ اور توقع بھی کیا کی جا سکتی ہے؟

جو حالات ہندو نے اب پیدا کر دیئے ہیں، ان کے پیش نظر دو ہی صورتیں باقی ہیں۔ یا تو ان کمینہ حرکات کے سامنے سپر اندازی سے ہندو کی انسانیت سوز بدعنوانیوں میں اور اضافہ کر دیا جائے جو اس کے لئے امنِ عالم کو تباہ و برباد کرنے کیلئے جرأت آموز ہو جائے اور یا اپنی ہستی کے قیام اور امن و فلاحِ انسانیت کے بقا و استحکام کی خاطر سر بلف اور کفن بدوش میدان میں اتر آجائے۔ اول الذکر راہ، تن آسانی اور عافیت کوشی کی ہے لیکن وہ تن آسانی ہے ایک بے غیرت انسان کی اور وہ عافیت کوشی ہے ایک بے حمیت عزت فروش کی۔ دوسری راہ، سختیوں اور مصیبتوں کی راہ ہے لیکن یہ وہ سختیاں ہیں جن پر ایک مردِ حسور ہزار عشرت طلبیاں قربان کر دیتا اور یہ وہ مصیبتیں ہیں جن پر ایک جوانِ غیور لاکھ راحت سامانیاں نچھاور کر دیتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عقل کا تقاضا عافیت کوشی اور امن طلبی ہوتا ہے۔ اس لئے کہ عقل کا فریضہ محض حفاظتِ نفس ہے۔ اس کے نزدیک انسانی زندگی سے زیادہ عزیز و گراں بہا کوئی متاع نہیں۔ لیکن انسانی زندگی میں ایسی اقدار بھی ہیں جنھیں جان دیکر خریدنا ہزار نفع کا سودا ہوتا ہے۔ شاہراہِ حیات میں ایسے مقام بھی تو آتے ہیں جہاں حقیقی زندگی، جان کی حفاظت میں نہیں بلکہ جان کی سپردگی میں پنہاں ہوتی ہے۔ جہاں پہنچکر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ

ہے کبھی جاں۔ اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی۔

یہی وہ مقام ہے جس کی طرف دعوت کے متعلق کہا ہے کہ یہ دعوت موت کی نہیں بلکہ عینِ حیات کی ہے۔ یاایھاالذین امنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم۔ اے ایمان کا دعویٰ رکھنے والو! لبیک کہو اپنے مرکزِ نظام کی اُس آواز پر جو تمہیں اس چیز کی طرف بلارہی ہے جو تمہیں زندگی عطا کردیگی۔ غور کیجئے۔ یہ دعوت تھی میدانِ جنگ کی طرف جانے کی جس میں موت سامنے دکھائی دیتی تھی۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ دعوت موت کی نہیں زندگی کی ہے۔ اس لئے کہ جو اس راہ میں مرتا ہے وہی تو درحقیقت زندہ ہوتا ہے۔ ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات۔ بل احیاء ولکن لا تشعرون۔ (۲/۱۵۴) جو قانونِ خداوندی کی حفاظت میں قتل ہوجائے اسے مردہ مت کہو۔ وہ مردہ نہیں، زندہ ہے۔ تمہارا عدمِ شعور ہے جو اسے مردہ دیکھ رہا ہے۔ یہی نہیں کہ اسے مردہ کہو نہیں۔ بلکہ اس کا خیال تک بھی دل میں نہ لاؤ کہ وہ مردہ ہے۔ (ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ اموات۔ ۳/۱۶۸)

اس وقت، اگر ہندو اپنی ضد سے باز نہ آیا تو مسلمانانِ پاکستان پر وہی وقت آچکا ہے جب موت میں عینِ حیات مضمر ہوتی ہے۔ اس وقت ہماری جان، مال، عزت، آبرو، ننگ و ناموس، عفت و عصمت، بلکہ خود وہ خطۂ زمین جسے ہم نے نظامِ خداوندی کی تجربہ گاہ بنانے کیلئے حاصل کیا ہے، سب خطرے میں ہوگا۔ ان کی حفاظت میں جان دیدینا، اصلِ زندگی ہے۔ یہ وہ "شیر کی ایک دن کی زندگی ہے جس پر بکری کی سو سال کی زندگی بھی قربان کردی جاسکتی ہے"۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمیں کوئی عسکری تربیت نہیں دی گئی۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہم شہری حفاظتی تدابیر تک سے بھی ہنوز ناآشنا ہیں۔ لیکن یہ وقت گلہ طرازیوں اور شکوہ سنجیوں کا نہیں۔ یہ وقت صرف جینے کے لئے مرجانے کا ہے۔ ان کنتم تعلمون۔

ہندوستان میں طلوعِ اسلام کی سول ایجنسی

ہاشمی نیوز ایجنسی۔ نعل صاحب روڈ۔ ناگپور ۲

کے پاس ہے۔ ہندوستان کے ایجنٹ اور خریدار اپنی
فرمائشیں انہی کے پاس بھیجیں۔

لاہور میں طلوعِ اسلام کی سول ایجنسی

مکتبہ جدید، چوک انارکلی کے پاس ہے۔

جنگ؟

انسان بھی اک طرفہ تماشا ہے!

اسے عبادت گاہوں میں سر جھکائے دیکھو تو آسمان کے فرشتے اس کی شانِ عبودیت پر نثار ہوتے ہیں، اس کی خاک لود پیشانی پر سطوت وثروت کے ہزار طرہ ہائے کہکشاں گیر قربان ہوتے ہیں۔ اس کے ذوقِ جبیں سائی پر جاہ وجلال کی لاکھوں غلغلہ اندازیاں اور شوکت وحشمت کی کروروں طنطنہ خیزیاں تصدق ہوتی ہیں۔ اس کی جھکی ہوئی نگاہوں کے سامنے حوروں کی معصومیت ہیچ اور اس کے قطراتِ انفعال کے مقابل کوثر وتسنیم کی گہرباریاں ناقابلِ التفات۔ اس کا ایک ایک سجدہ زمین وآسمان کو وجد میں لاتا ہے اور اس کے جذبۂ تعبد وتذلل کی شانِ رعنائی پکار پکار کر کہہ رہی ہوتی ہے کہ

تیرے سنگِ در نے بدل دیا ہے، یہ پستیوں کو فراز میں
کہ ہزاروں عرش جھلک رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں

اور اگر اسے محبت کے حریمِ قدس میں دیکھو تو کسی کی یاد میں اس کے ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کو چاند اپنے بلوریں کٹورے میں بھر لیتا ہے کہ وہ ظلمتکدۂ عالم میں شمع کافوری کا کام دیں۔ آفتاب اس کی آتشِ پنہاں سے کچھ حرارت مستعار لیتا ہے کہ اس سے نبضِ ہستی میں تموج پیدا کرے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی تپش وخلش اور سوز وگداز سے اپنے اندر زندگی محسوس کرتا ہے۔ اس کی آہِ سحرگاہی اور نالۂ نیم شبی اس حقیقت کے آئینہ دار ہوتے ہیں کہ

عشق سکون وثبات، عشق حیات وممات ۔ عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات

اور اگر اسے حیرت خانۂ علوم وفنون میں جلوہ بار دیکھو تو اس کا فکرِ فلک پیما زمین کی پستیوں سے آسمان کی بلندیوں تک کے راز فاش کرتا ہے۔ مہر ومہ وستارہ سب اس کی کمندِ تخیل کے اسیر ہوتے ہیں۔ وہ زہر سے تریاق بناتا ہے جو نوعِ انسانی کے ہلاکت انگیز ناسو کے لئے مرہمِ جاں بخش کا کام دیتا ہے۔ اس کے فنونِ لطیفہ کی اختراعاتِ جمیلہ اس ہاروبابس محبس آب وگِل کو جذبات واحساسات کی حسین جنت میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ اس کی صنعتی گل کاریاں، تہذیب وتمدن کے قصرِ بلند میں نور ونکہت کے سامان ارزاں کرتی ہیں۔ وہ ان نوادرات کی متاعِ گراں بہا کے پیشِ نظر خالقِ کائنات کے سامنے بجا طور پر فخر کرتا ہے کہ

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم ۔ سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان وکہسار وراغ آفریدی ۔ خیابان وگلزار وباغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم ۔ من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

لیکن

یہی انسان جب جذبۂ انتقام و ہوسِ خون آشامی سے مغلوب ہو کر اپنے ہی جیسے انسانوں کے خلاف غم و غصہ میں بھرا ہوا اٹھتا ہے تو عبودیت کا عجز و انکسار، محبت کا سوز و گداز اور علم و حکمت کا نورِ بصیرت، سب ایک ایک کر کے الگ ہو جاتے ہیں اور اس کی خوفناک سبعیت و بربریت وحشی سے وحشی درندوں سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے۔ یہ ایک آتش بار اژدھا کی طرح پھنکارتا اور ایک ہیبت ناک شیر کی طرح گرجتا اٹھتا ہے اور تہذیب و تمدن، عقل و ہوش، علم و بصیرت، عدل و انصاف، رحم و کرم۔ غرضیکہ جوہرِ انسانیت کی ایک ایک خصوصیت کو کچلتا، روندتا، طوفانِ بلا کی طرح آگے بڑھتا اور ایک بھیانک عفریت کی طرح اپنا آہنی پنجۂ استبداد فریقِ مقابل کے سینے میں گاڑ دیتا ہے اور اپنے دندانِ حرص و آز کو اس کی رگِ جاں میں پیوست کر کے اس کے چشمۂ حیات سے اپنی ہوسِ خون آشامی کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اس غیظ و غضب کے عالم میں وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ وہ اپنی قوت کے نشہ میں اس قدر بدمست ہو جاتا ہے کہ کوئی معقول بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ دلیل و برہان کا جواب تیغ و سنان سے دینا چاہتا ہے۔ وہ باہمی افہام و تفہیم سے معاملات سلجھانے کی بجائے، فریقِ مقابل کو توپ و تفنگ سے دھمکا کر اپنی بات ماننے پر مجبور کرنا چاہتا ہے۔ وہ کسی کے مشورے کو خاطر میں نہیں لاتا کسی کی ثالثی پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کی ان حرکات پر عقل ہنستی ہے، خرد ماتم کرتی ہے، شرافت شرماتی ہے، انسانیت مارے ندامت کے ڈوبتی چلی جاتی ہے لیکن اسے ان میں سے کسی کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ عقل و خرد اور شرافت و انسانیت جن جذبات کو اپیل کر سکتی ہے وہ ان سے عاری ہو چکا ہوتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ وہ جذبات، قوت کی بدمستیوں کے نیچے اسی طرح دب جاتے ہیں جس طرح شراب کے نشے سے انسان کے ہوش و حواس پر پردہ پڑ جاتا ہے (کہ خمر کے معنی ہی ڈھانپنے والی شے کے ہیں)۔

سوال یہ ہے کہ کیا ایسے انسان کو ان حالات میں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جو اس کے جی میں آئے کرے؟ ہمارا خیال ہے کہ دنیا کا بدسے بدتر انسان بھی یہ نہیں کہے گا کہ ہاں! ایسے انسان نما درندے کو کھلا چھوڑ دینا چاہئے کہ وہ نیستانِ ہستی میں اپنے فتنہ و فساد کی چنگاریاں پھینکتا پھرے اور اس طرح امنِ عالم اور فلاحِ انسانیت کو پھونک کر راکھ کا ڈھیر بنا دے۔ انسانی معاشرے کے آئین و ضوابط نے ایسے انسان کے لئے انتظام کر رکھا ہے۔ اگر وہ طبعی طور پر فاتر العقل ہو چکا ہے تو اسے پاگل خانے میں بھیج دیا جاتا ہے اور اگر اس کی عقل و خرد ہی اُسے ان فساد انگیزیوں پر ابھارتی ہے تو اسے لوہے کی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا جاتا ہے تاکہ نوعِ انسانی اس کے دندانِ حرص و آز اور ناخنِ جور و استبداد سے محفوظ رہ سکے۔ پولیس اور عدالت اسی مقصد کیلئے ہوتی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ایک فرد کے بجائے ایک قوم (یا مملکت) اس طرح عقلی توازن کھو بیٹھے اور اپنی حقیقی یا مزعومہ قوت کے نشہ میں کسی دوسری قوم یا مملکت کے جائز حقوق کو غصب کرنا چاہے اور اسے جینے تک کا حق نہ دے تو اس کا کیا علاج کیا جائے!

اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس سے وہ قوت چھین لی جائے جو اس کی ان بدمستیوں اور فتنہ انگیزیوں کا باعث بن رہی ہے۔ لیکن قوت، بغیر قوت کے چھینی نہیں جا سکتی۔ ان حالات میں قوت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ دونوں قوتوں کے اس تصادم کا نام جنگ ہے۔ قوتیں دونوں طرف ہیں۔ لیکن غور کیجئے کہ ایک قوت کس مقصد میں صرف ہو رہی ہے اور دوسری قوت

کس مطلب کے لئے!

یہی وہ مقام ہے جہاں قرآن جنگ کی اجازت ہی نہیں دیتا بلکہ حکم دیتا ہے۔

قرآن کے نزدیک انسانی زندگی بیش بہا متاع ہے جس کی حفاظت نہایت ضروری ہے۔ وہ اس حفاظت کو کس قدر اہمیت دیتا ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ

..... من قتل نفساً بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعاً (۵/۳۲)

جس نے کسی جان کو قتل کر ڈالا، سوا اس حالت کے کہ قصاص لینا ہو یا ملک میں فساد برپا کرنے والوں کو سزا دینی ہو، تو یوں سمجھو گویا اس نے تمام نوعِ انسانی کو قتل کر ڈالا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرتا کہ جب کوئی انسان یا انسانوں کا گروہ (جسے قوم یا مملکت کہا جاتا ہے) وحشت اور درندگی کے اس مقام تک جا پہنچے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس کی اصلاح کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو، نوعِ انسانی کی بہبودِ کلی کے لئے، اس انسانیت کے مجرم انسان یا قوم کے خلاف قوت استعمال کرنا اسی طرح (طوعاً و کرہاً) ناگزیر ہو جاتا ہے جس طرح جب کسی انگلی کا ناسور یکسر لاعلاج ہو جائے اور اس کا زہر باقی حصۂ جسم کو بھی موت کی طرف لئے جا رہا ہو، تو باقی جسم کو اس زہر سے بچانے کیلئے اس زہر آلود انگلی کا کاٹ کر الگ کر دینا، نہ صرف جائز بلکہ جسم کی بہبودِ کلی کے لئے لابنفک ہو جاتا ہے۔ اگر اس وقت ایسا نہ کیا جائے تو کچھ وقت کے بعد پورے کا پورا جسم مسموم ہو کر قبر میں جا پہنچے گا اور اس کے ساتھ ہی وہ انگلی بھی ختم ہو جائیگی جسے کاٹ کر الگ نہیں کیا گیا تھا۔ یعنی پہلے تو صرف ناکارہ انگلی ہی نے ختم ہونا تھا لیکن اب انگلی کے ساتھ پورا جسم بھی تباہ ہو گیا۔

انسانی معاشرے کو اس قسم کے زہر سے متاثر کرنے کا نام، قرآن کی اصطلاح میں "فتنہ و فساد" ہے جسے وہ (انگلی اور جسم والی مثال کے مطابق) قتل سے بھی زیادہ نقصان رساں اور تباہ کن قرار دیتا ہے۔ اس لئے اس کا ارشاد ہے کہ الفتنۃ اشد من القتل۔ یعنی فتنہ و فساد جنگ سے بھی زیادہ تباہ کن ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ فتنہ و فساد کے استیصال کے لئے قوت کا استعمال ناگزیر سمجھتا ہے۔ یعنی فتنہ برپا کر دینے والی قوت کو زیر کرنے کیلئے قوت کا استعمال، تاکہ انسانی معاشرہ اس کی شرانگیزیوں سے محفوظ رہے۔ غور کیجئے، قرآن نے اس حقیقت کو کیسے جامع اور بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ قوت صرف اس وقت تک استعمال کرنی چاہئے جب تک وہ شرانگیز اور فتنہ پرور قوت سپر انداز نہ ہو جائے۔ حتی تضع الحرب اوزارھا (۴۷/۴) یہانتک کہ خود جنگ اپنے ہتھیاروں کو پھینکدے۔ یعنی جس مقصد کے لئے یہ جنگ ناگزیر ہو گئی تھی وہ مقصد حاصل ہو جائے اور انسانی معاشرہ سرکش قوتوں کی فساد انگیزیوں سے محفوظ ہو جائے۔ چونکہ اس تادیبی عمل میں کسی انتقام یا غصے کو دخل نہیں ہوتا بلکہ یہ کارروائی ایک ڈاکٹر کے آپریشن کی سی ہوتی ہے، اس لئے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ جونہی اُس سرکش قوت کے متعلق دیکھو کہ وہ اپنی قہرمانیت و فرعونیت کو چھوڑ کر آمادۂ تسلیم و رضا ہو رہی ہے، اسے فوراً اپنے دامنِ عافیت میں لے لو۔ وان جنحوا للسلم فاجنح لھا۔

اس تادیبی کاروائی کے دوران میں بھی نگاہ اس مقصد کی طرف رہے جس کی خاطر یہ ناگزیر قدم اٹھایا گیا ہے۔ یعنی اندھی قوت کی سرکشی کو درست کرنے کی طرف۔ اسی لئے نبی اکرمؐ ایسے مواقع پر ہمیشہ تاکید فرمایا کرتے تھے کہ کسی بوڑھے کو، بچے کو اور عورت کو قتل نہ کرو۔ (ابوداؤد)۔ اسی طرح غیر محارب (Civil) آبادی کو ناحق تنگ کرنے کی بھی ممانعت فرمادی۔ ابوداؤد میں حضرت انس جہنیؓ سے روایت ہے کہ میں کسی غزوہ میں حضورؐ کے ساتھ تھا۔ لشکریوں نے فریق مقابل کے پڑاؤ پر جا کر انھیں تنگ کیا۔ لوٹا مارا۔ حضورؐ نے فوراً منادی کرادی کہ جو شخص غیر محارب آبادی کے گھروں میں گھس کر انھیں تنگ کرے یا لوٹ مار کرے اس کا جہاد قبول نہیں۔ اس طرح کی لوٹ کھسوٹ کا مال بھی ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ ابوداؤد میں ایک انصاری کا بیان ہے کہ ہم حضورؐ کے ساتھ ایک سفر میں شریک تھے۔ لوگوں کو بھوک نے ستایا تو انھوں نے کچھ بکریاں لوٹ کر انھیں ذبح کر لیا اور گوشت کی ہانڈیاں چڑھا دیں۔ حضورؐ کو خبر ملی تو آپ تشریف لائے اور جو کمان ہاتھ میں تھی اس سے سب ہانڈیاں الٹ دیں اور فرمایا کہ لوٹ کی چیز مردار سے بھی بڑھ کر حرام ہے۔ اسی طرح دشمن کے قاصدوں سے کبھی بدسلوکی نہیں کی جاتی تھی۔ اسیرانِ جنگ سے اپنے عزیز مہمانوں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ جب حضورؐ نے اسیرانِ بدر کو صحابہؓ کے حوالے کیا ہے تو تاکید فرمادی کہ انھیں کھانے پینے کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ چنانچہ صحابہؓ خود تو کھجوروں پر گذارہ کرتے تھے اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ اسیرانِ جنگ کے علاوہ دشمن کا جو آدمی مسلمانوں سے پناہ طلب کرے اس کی پوری پوری حفاظت کی جاتی تھی۔ یہ سب اس لئے کہ جنگ سے مقصود انتقام جوئی یا ہوسِ خون آشامی یا جوع الارض کی تسکین نہ تھی بلکہ انسانی معاشرے میں آئین عدل و احسان کا قیام تھا۔ اس حقیقت کو حضورؐ نے نہایت جامع الفاظ میں بیان فرمایا تھا۔ جب حضورؐ سے دریافت کیا گیا کہ کوئی شخص غنیمت کے لئے، کوئی نام کیلئے، کوئی اظہارِ شجاعت کیلئے جہاد کرتا ہے۔ کس کا جہاد راہِ خدا میں سمجھا جائے گا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ من قاتل لتکون کلمۃ اللہ العلیا۔ جو شخص اس لئے لڑتا ہے کہ خدا کا قانون غالب رہے اس کا لڑنا جہاد ہے۔ اسی کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ویکون الدین کلہ للہ۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قوت کے استعمال کی نوبت اس وقت آئیگی جب باہمی افہام و تفہیم کے ذریعے تصفیہ معاملات اور اصلاح حال کی تمام کوششیں ناکام رہ جائیں۔ سوال یہ ہے کہ جب دو افراد کے درمیان جھگڑا یا اختلاف ہو تو عدالت ایک حَکم (ثالث) کی حیثیت سے فیصلہ دیدیتی ہے جس سے وہ جھگڑا طے ہو جاتا ہے۔ لیکن جب یہ جھگڑا یا اختلاف دو قوموں کے درمیان ہو تو اس وقت کیا کیا جائے؟

قرآن نے اس ضرورت کو بھی سمجھ لیا تھا اس لئے اس کا حل بھی بتا دیا تھا۔ اس نے کہا کہ دنیا میں کسی ایسی جماعت کا وجود نہایت ضروری ہے جو تمام اقوامِ عالم کی نقل و حرکت اور اعمال و کردار کا محاسبہ کرتی رہے اور اختلافی مواقع پر باہمی طے شدہ آئین و ضوابط کے مطابق فیصلے کرے اور ان کی خلاف ورزی کے اقدامات کو روکے (تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر) قرآن نے اس جماعت کا نام امتِ مسلمہ رکھا تھا یعنی دنیا میں امن و سلامتی کی ضامن جماعت اور اس کی خصوصیت یہ بتائی تھی کہ وہ اپنے

اس فریضۂ محاسبۂ اعمالِ امم میں اس انداز سے جادۂ حق و عدل پر قائم رہیگی کہ دنیا کی ہر قوم اس سے برابر کے فاصلے پر....... (Equidistant) ہوگی۔ اس خصوصیت کی حامل قوم کو عربی الفاظ میں امتِ وسطیٰ کہتے ہیں۔ چنانچہ اس جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن نے کہا تھا کہ

وکذالک جعلنٰکم امۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا۔

اس طرح ہم نے تمہیں امتِ وسطیٰ بنایا ہے تاکہ تم تمام نوعِ انسانی کے اعمال و کردار کے نگراں رہو اور تمہارے اعمال و کردار کا نگراں تمہارا مرکزِ نظامِ خداوندی ہو۔

ظاہر ہے کہ اس فریضہ کو سرانجام دینے والی جماعت کے پاس اتنی قوت ہونی چاہئے کہ وہ نہ صرف اپنے آپ کو ہی محفوظ و مصئون رکھ سکے بلکہ دیگر اقوام سے اپنے فیصلوں کو منوا بھی سکے۔ جس عدالت کی پشت پر قوتِ نافذہ نہ ہو اس کے فیصلے قانون کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتے، محض وعظ بنکر رہ جاتے ہیں۔ دین اور مذہب میں یہی فرق ہوتا ہے۔ مسلمان صدیوں سے دین سے محروم ہو چکا ہے اور مذہب کے فریب میں مبتلا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ نہ صرف یہ خود ہی نکبت و زبوں حالی کی زندگی بسر کر رہا ہے اور دنیا کی ہر متغلب قوت کے سامنے سپرانداز ہے بلکہ اس کی وجہ سے دنیا "امتِ وسطیٰ" سے بھی محروم ہو چکی ہے جس کا فریضہ "شھداء علی الناس" تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ساری دنیا فتنہ و فساد کا جہنم بن چکی ہے۔ سرکش اور بےباک قوتیں جو چاہتی ہیں وہی ہوتا ہے اور کمزور کے لئے رونے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ چونکہ دنیا میں امتِ وسطیٰ کا وجود نہیں رہا اس لئے "شھداء علی الناس" کا فریضہ "کفن چوروں" کے سپرد ہو چکا ہے۔ اور ایسا ہونا بھی چاہئے تھا۔ جہاں خدا کا قانون عمل پیرا نہیں ہوتا وہاں ابلیسی نظام کی بساط بچھ جاتی ہے کیونکہ —— خلا محال ہے فطرت کے کارخانے میں۔ یہ وجہ ہے کہ وہ امت جسے امتِ وسطیٰ بننا تھا، اپنے فریضے کو فراموش کر کے نہ صرف اپنے جرائم ہی کی سزا بھگت رہی ہے بلکہ دنیا بھر کے جرائم کی پاداش میں بھی بالواسطہ شریک ہے۔ سو جانے والے چوکیدار کے نہ صرف اپنے کپڑے ہی چوری جاتے ہیں بلکہ وہ صبح اٹھ کر محلہ والوں سے پٹتا بھی ہے۔

لیکن اگر وہ صرف سویا ہوا ہی ہے، مر نہیں چکا، تو اس کی بھی امید کی جا سکتی ہے کہ وہ چوروں کی آہٹ پا کر اٹھ بیٹھے اور اس طرح اپنی متاع بھی محفوظ کر لے اور جن کی حفاظت اس کے سپرد تھی ان کی متاعِ حیات بھی محفوظ رہے۔

خدا کرے کہ ہم زمانے کے تھپیڑوں سے جاگ اٹھیں اور ہمارے جاگنے سے چور بھاگ جائیں اور شریف انسان اطمینان کی نیند سوئیں۔

حج

[محترم پرویز صاحب کی تقریر جو تقسیم ہند سے بہت پہلے آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے ۲۹ دسمبر ۱۹۴۱ء کی شام کو نشر ہوئی۔ آپ اس تقریر کو پڑھ کر یقیناً ہم سے متفق ہوں گے کہ تقریب حج پر آج بھی اس سے بہتر تعارفی مقالہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ طلوع اسلام]

مذہب کے متعلق عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ وہ ایک فرد کی ذاتی اصلاح کا ذریعہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ افراد کی ذاتی اصلاح نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہ اصلاح اصل مقصد نہیں۔ عمدہ گھڑی کے ہر پرزہ کے لئے مضبوط اور درست ہونا ضروری ہے۔ لیکن اگر یہ پرزے الگ تھلگ پڑے ہوں تو ان کی پائیداری اور مضبوطی کسی کام کی نہیں۔ یہی پرزے جب ایک نظام کے ماتحت، ایک خاص ترتیب سے، ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں تو ان میں سے ہر پرزہ کی حرکت، دوسرے پرزوں پر اثر انداز ہوگی اور اس طرح ان کی اس مجموعی حرکت کا جیتا جاگتا نتیجہ، محسوس شکل میں گھڑی کے ڈائل پر نمودار ہو جائے گا۔ اسلام افراد کی اصلاح سے ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے جو نظام انسانیت کو عدل پر چلا سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے ایک ایسا عملی پروگرام مرتب کر دیا ہے جس میں ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھتا ہے۔ نماز کے لئے پانچ وقت کا اجتماع۔ تقویٰ، ضبط نفس، غیر اللہ کی محکومی سے انکار۔ اللہ کی حاکمیت کا اقرار، مرکزیت، اجتماعیت، اطاعتِ امام کا عملی مظاہرہ ہے۔ جمعہ کے اجتماع میں یہ دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ عید کی تقریب پر اس کی حدود اور زیادہ پھیل جاتی ہیں اور بالآخر حج کے میدان میں اس کی وسعتیں ساری دنیا کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہیں۔ رمضان مبارک کے پورے مہینے کی مشق و ریاضت کے بعد جب ذہنوں میں جلا، دلوں میں تازگیٔ ایمان، نگاہوں میں مومنانہ فراست اور خون میں مجاہدانہ حرارت پیدا ہو گئی تو عید الفطر کے اجتماع میں ہر مقام سے ملتِ اسلامیہ کی نمائندگی کے لئے بہترین افراد کا انتخاب ہوا۔ مسلم نمائندوں کے یہ قافلے دنیا کے دور دراز گوشوں سے جنگل، بیابان، کوہ اور دریا کے مرحلوں کو طے کرتے ہوئے۔ من کل فج عمیق۔ اپنی بین الملی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے چاروں طرف سے ایک مرکز کی طرف سمٹے چلے آ رہے ہیں۔ دنیا میں کوئی جماعت بلا مرکز قائم نہیں رہ سکتی۔ مسلمانوں کے فکر و نظر کا مرکز قرآن، اطاعت کا مرکز امیر اور اجتماعیت کا مرکز وہ بیت الحرام ہے جو ایک خدا کے ماننے والوں کے مورث اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقدس ہاتھوں سے وجود میں آیا اور دنیا کے بتکدہ میں خدا کا پہلا گھر کہلایا۔ اِنَّ اَوَّلَ بیتٍ وُضِعَ للنَّاس للذی ببکۃ مبارکاً وّھدی للعٰلمین (۳/۹۶) بلاشبہ پہلا گھر جو تمام انسانوں کے لئے (بطور مرکز) بنایا گیا وہی ہے جو بکہ میں ہے، برکت والا اور تمام دنیا کے لئے ہدایت کا سرچشمہ۔ وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِناً۔ جو کوئی اس کے حدود میں داخل ہوا وہ امن اور حفاظت میں آ گیا۔

اسلام دنیا میں جس نظام کو قائم کرنے کے لئے آیا ہے اس کی بنا اس اصول پر ہے کہ تمام انسان ایک برادری کے فرد ہیں وہ ان تمام غیر فطری حد بندیوں کو توڑنے کے لئے آیا ہے جن سے انسانوں کی یہ برادری مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ نسل کا امتیاز، رنگ اور زبان کا امتیاز، جغرافیائی حدود کا امتیاز اس کے نزدیک سب غیر فطری حد بندیاں ہیں۔ اس لئے خدا کے اس گھر میں جب انسان جمع ہوں گے تو باطل کے ان امتیازات میں سے کوئی امتیاز باقی نہیں رہے گا۔ چینی، جاپانی، ہندی، افغانی، ایرانی، تورانی، حبشی افرنگی سب ایک ملت کی شکل میں اس عظیم الشان حقیقت کا اعلان کرنے کے لئے جمع ہوں گے کہ

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

یہی نہیں بلکہ مختلف قسم کے لباسوں سے جو اعلیٰ اور ادنیٰ کے امتیاز کی جھلک نمودار ہو سکتی ہے اسلام نے اسے بھی روا نہیں رکھا اور حکم دیدیا کہ ارضِ حرم میں داخل ہونے سے پہلے سب ایک ایک بن سلی چادر میں لپٹے ہوئے حاضر ہوں۔ تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری۔ یہ ہے وہ وردی جو اسی بین الملی کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کے لئے تجویز کی گئی ہے۔ یوں باطل کے ہر امتیاز کو مٹاتے وحدت کے رنگ میں رنگے یہ قافلے چاروں طرف سے، اپنے مرکز کی طرف بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ سب ایک آقا کے غلام۔ ایک حاکم کے محکوم۔ ایک قانون کے تابع۔ ایک نظام کے پابند۔ فقیرانہ لباس، ننگے سر، گدایانہ وضع، قلندرانہ ادائیں، سکندرانہ جلال، دنیا بھر کے آستانوں سے بے نیاز، مستانہ وار گذرتے ہوئے **ایک** کی چوکھٹ پہ سر جھکانے کے لئے بیتاب، دل و فورِ شوق سے بے قرار، آنکھیں مئے توحید سے نشہ بار، لبیک اللھم لبیک کہتے ہوئے یوں رواں دواں، جانب مرکز کھنچے چلے آرہے ہیں جیسے شہد کی مکھیاں، رنگ و بو کی فضاؤں کے جوہر اپنے سینوں میں بھر کر سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے شام کے وقت اپنے چھتے کی طرف پروانہ وار اڑتی چلی آرہی ہوں کہ اپنی محنتوں کا سرمایہ، تگ و دو کا ماحصل۔ مرکز میں لاکر اکٹھا کر دیا جائے۔

زمانۂ ابراہیمی میں رواج تھا کہ عہد و پیمان کی پختگی کے لئے ایک پتھر پر ہاتھ مارتے تھے۔ جب ان رہروانِ منزل شوق کے قافلے حریم کعبہ میں پہنچے تو اس عہد و پیمان کی تجدید کے لئے جو انھوں نے اپنے اللہ سے باندھ رکھا ہے، حجرِ اسود کو چھوا۔ بعض نے ہجوم کی وجہ سے دور ہی سے اشارہ کر دیا۔ کسی نے پیمان کے تقدس کی رعایت سے ہاتھ کو چوم لیا اور یوں اس عہد کی تجدید ہوئی کہ

ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین لا شریک لہ وبذلک امرت وانا اول المسلمین ۰

میری نماز، میرا حج، میرا جینا، میرا مرنا، سب اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام کائنات کا پروردگار ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں خدا کے فرمانبرداروں میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں۔

اس عہد و پیمان کی تجدید سے، وجد و مسرت اور سرمستی و شیفتگی کی وہ کیفیت طاری ہوئی کہ والہانہ انداز میں خدا کے اس گھر کے گرد پروانہ وار گھوم رہے ہیں۔ کوئی کعبہ کی چوکھٹ پر سر رکھے محو نیاز ہے۔ کوئی اس کا غلاف تھامے عالم وارفتگی میں جھولی پھیلائے کھڑا ہے۔ دل میں مقدس آرزوؤں کا ہجوم۔ آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسو، لب پر دعائیں، محویت کا عالم، آسمان سے نور کی بارش، رحمتوں کا نزول، غرضیکہ ایک نئی دنیا اور ایک عجیب سماں ہے۔

خیمہ ہائے حجاز کے متوالوں کے یہ قافلے ۸ تاریخ کو عرفات کے میدان کی طرف روانہ ہوگئے۔ پاک اور صاف، سر سے پاؤں تک للّٰہیت میں ڈوبے ہوئے۔ قدم وادیٔ مکہ میں۔ نگاہیں عرش معلیٰ پر۔ کوئی تیز گام، کوئی آہستہ خرام۔ کشاں کشاں۔ ۹ تاریخ کو اس میدان میں آجمع ہوئے۔ کیا حسین نظارہ ہے۔ سب ایک آقا کے غلام، ایک ملت کے فرد ایک ہی وضع، ایک ہی انداز، بھائی سے بھائی ملا۔ ایک کا دوسرے سے تعارف ہوا کہ اس مقام کا نام ہی **عرفات** کا میدان ہے، اجتماع کیا ہے؟ مساوات اور محبت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ جس میں ہر قطرہ، اپنے آپ کو خود سمندر محسوس کرتا ہے۔ یہ سب خدا کے حضور جمع ہوئے ان کا منتخب **امام** منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آیا۔ اس نے ملت کی اجتماعی حالت پر تبصرہ کیا۔ اور سال بھر کے لئے ایک مرتب شدہ پروگرام کا اعلان کر دیا، جس کی تکمیل کے لئے دعائیں مانگی گئیں، التجائیں کی گئیں اور یوں یہ عظیم الشان اجتماع۔ زندہ آرزوؤں کی ایک نئی دنیا اپنے جلو میں لئے۔ دوسری صبح منیٰ کے میدان میں آگیا۔ یہی وہ میدان ہے جہاں ملتِ حنیفہ کے پیشوائے اعظم، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لئے پیشانی کے بل لٹا دیا تھا۔ اور یوں اپنے ایمانِ محکم کا عملی ثبوت دیا تھا کہ تیرا حکم ہو تو عزیز ترین متاع بھی بلا تامل نثار کر دی جا سکتی ہے۔ اس صحرائی قربان گاہ میں پہنچکر ملت اسلامیہ کے ان نمائندوں نے اس اقرار کو دہرایا کہ تیرا نام بلند کرنے کیلئے جو پروگرام مرتب ہوا ہے اس کی تکمیل میں جس قربانی کی ضرورت ہوگی بلا دریغ کر دی جائے گی۔ یہاں پہنچکر مختلف ملکوں کے نمایندوں نے اپنے اپنے خیمے لگائے۔ یہ سب اللہ کے مہمان ہیں اس لئے خود ہی مہمان اور خود ہی میزبان ہیں۔ آج صبح ہندی مسلمانوں کے ہاں سب کے کھانے کا انتظام ہے۔ شام کو ایرانیوں کا اہتمام ہے۔ ان دعوتوں کے لئے قربانیاں کی جا رہی ہیں۔ سامان تو کھانے پینے ہی کا ہے، لیکن چونکہ وہ مقصد عظیم جس کے لئے یہ اجتماع ہوا ہے خالصۃً اللہ کے لئے ہے اس لئے یہ دعوتیں بھی دنیا کی دعوتوں سے نرالی ہیں۔

لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَاءُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ کَذٰلِکَ سَخَّرَھَا لَکُمْ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (۲۲/۳۷)

اللہ تک ان قربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ بلکہ تمہارے دل کا تقویٰ، پاکیزگیٔ مقصد پہنچتی ہے۔ اس نے ان جانوروں کو اس طرح تمہارے لئے مسخر کر دیا کہ تم اللہ کی رہنمائی پر اس کے نام کو بلند کرو، اور نیک کرداروں کے لئے بشارت ہے۔

دعوتیں اور ضیافتیں ہیں۔ ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملک والوں کو اپنے مقامی حالات سے آگاہ کر رہے ہیں، دماغی اور قلبی تعارف ہو رہا ہے۔ ادھر ادھر مختلف ملکوں کی مصنوعات کی نمائش لگ رہی ہے، خرید و فروخت ہو رہی ہے۔ لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ (۲/۱۹۸) اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم (حج میں) اپنے رب کا فضل (یعنی معیشت) کماؤ۔ اس طرح یہ اجتماع ملتِ اسلامیہ کے لئے دینی اور دنیاوی، سیاسی، اقتصادی، معاشی، معاشرتی فوائد کا ذریعہ بن رہا ہے کہ حج کا مقصد ہی ہے لِیَشْھَدُوْا مَنَافِعَ لَھُمْ تاکہ لوگ اپنے فوائد کے لئے حاضر ہوں۔

تین دن یہ اجتماع رہا جس میں عالم اسلامی کے ہر گوشے اور ملتِ اسلامیہ کے ہر شعبے کے متعلق باہمی تبادلۂ خیالات ہوا۔

اُدھر یہ ہو رہا ہے۔ اِدھر تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ملت کے افراد، اپنے اپنے ہاں وادیٔ مکہ کے اجتماع سے ہم آہنگی پیدا کرنے کیلئے عیدگاہوں میں جمع ہو رہے ہیں۔ ہم آہنگی پیدا کرنے کیلئے نیز اس پروگرام کو سننے کیلئے جس کا اعلان ایک دن پہلے میدانِ عرفات میں ہوا ہے۔ اس پروگرام کی اطلاعیں ریڈیو اور تار برقی سے تمام عالمِ اسلامی تک پہنچ چکی ہیں۔ مقامی مسلمان عیدگاہوں میں پہنچے، اپنے اپنے خطیبوں سے اس پروگرام کو سن لیا اور سمجھ لیا جس پر اب سال بھر عمل کیا جائے گا۔ وہ تھا حج، یہ ہے عید۔ وہ فریضۂ مقدس جس میں نوعِ انسانی کے قیام و بقا کا راز ہے۔ تمام انسانوں کا اسلئے کہ مسلمان دنیا میں اپنے ہی لئے نہیں جیتا بلکہ اس کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ تمام دنیا کو اس نظام پر چلائے جس سے انسانیت بڑھے، پھولے، پھلے اور عروج و ارتقار کی منزلیں طے کر کے اس منزل سے اگلی منزل میں جا پہنچے۔ حج اس نظام کی سب سے اہم کڑی اور کعبہ اس نظام کا مرکز ہے۔ جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیٰما للناس (۵ء) اللہ نے کعبہ کو جو حرمت کا گھر ہے تمام انسانوں کے لئے قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔ انسانوں نے مختلف خطوط پر مختلف قسم کی جمعیتیں بنا بنا اور بگاڑ بگاڑ کر مختلف تجربے حاصل کئے ہیں اور ہر تجربے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ —— تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی —— یہ سب اس لئے کہ جن اصولوں پر یہ جمعیتیں بنائی گئیں وہ سب غیر فطری تھے۔ فطرت کے مطابق تو ایک ہی اصول ہے اور وہ یہ کہ انسانوں کی تقسیم ملکوں اور قوموں کی رو سے نہ کی جائے بلکہ تمام انسانوں کو ایک عالمگیر برادری تصور کر کے انھیں ایک مرکز کے ماتحت خدا کے قانون کے تابع رکھا جائے۔ یہی وہ عظیم الشان اصول ہے جس کی رو سے مکہ کو ھدی للعٰلمین تمام دنیا کے لئے ہدایت کا سرچشمہ اور کعبہ کو قیٰما للناس، تمام نوعِ انسانی کے قیام کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ اس جمعیت آدم کا فطری نتیجہ ہے، دنیا کا امن و سکون ومن دخلہ کان اٰمنا۔ جو اس میں داخل ہوا امن و حفاظت میں آ گیا۔ حج اور عید اسی منزل کے نشانِ راہ ہیں۔

یہ صندوقِ کتب...

(ایک خط اور اس کا جواب)

عرشی

خط | مجھے آپ نے جو قرآن شریف کا ترجمہ مطالعہ کے لئے دیا ہے آپ کا بیحد مشکور ہوں، آپ کو معلوم ہے کہ میں نے وید، اپنشد، ستیہ رتھ پرکاش، گرنتھ وغیرہ دھارمک پستکوں کا غور سے مطالعہ کیا ہے۔ اور یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ مجھے مذہبی تعصب کی ہوا تک نہیں لگی۔ ہندوؤں سے زیادہ مسلمانوں کے ساتھ میرے مخلصانہ تعلقات قائم رہے ہیں۔ یوں تو پہلے بھی میرے اندر اسلام کے خلاف کوئی جذبہ کبھی نہیں رہا، شاید یہ آپ لوگوں کی محبت بھری صحبتوں کی وجہ سے ہے۔۔۔ لیکن قرآن شریف کے حالیہ مطالعہ نے تو میری ذہنی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اب اسلام مجھے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی طرف کھینچ بھی رہا ہے اور جب میں ذرا کھنچ آتا ہوں تو انہی ہاتھوں سے دھکیل کر پیچھے کو بھی ہٹا دیتا ہے۔ عجیب کشمکش کی حالت میں آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ آپ حیران ہوں گے کہ میں کیسی متضاد باتیں کہہ رہا ہوں۔ ذرا شرح سُن لیجئے۔

جہاں تک تنِ قرآن کا تعلق ہے، اس کے سیاسی اور قانونی احکام کو چھوڑ کر (جن کو سمجھنے کے لئے مجھ سے بہتر اور مختلف دماغ کی ضرورت ہے) باقی بہت زیادہ آیتیں ایسی ہیں، جن میں ایک صاف دل انسان کیلئے جاذبیت سے بھی زیادہ کوئی اور چیز محسوس ہوتی ہے، جو انسانی روح کو اس ظلم و گناہ کی دنیا سے نکال کر کسی اور عالم میں لے جاتی ہیں اور سچ پوچھئے تو مجھے خدا یا پرماتما کی اتنی زیادہ "مقدار" کسی اور کتاب میں نظر نہیں آتی جتنی قرآن میں (کاش آپ میرا مطلب سمجھنے میں غلطی نہ کریں) دورانِ مطالعہ میں (آپ شاید تناقض کہتے ہیں) مجھے تو ایسا معلوم ہوتا رہا ہے کہ میرے ارد گرد، آگے پیچھے، اندر باہر خدا ہی خدا ہے۔ میں جانوں یا نہ جانوں، محسوس کروں یا نہ کروں، وہ ہے اور یقیناً ہے۔ آتما (روح) کے لئے یہ خنک احساس، شانتی کی دھارا ہونے کے علاوہ ایک مضبوط آسرا بھی ہے۔ اور پھر اس میں جس قسم کے لوگوں کو مسلمان، مومن، صالح اور متقی کہا گیا ہے اور ان کی جو خوبیاں بیان کی گئی ہیں، جی چاہتا ہے کہ اگر جان کی قیمت پر بھی ایسے لوگوں کی صحبت میسر آجائے تو مر جانا ہی اچھا ہے، یہ کوئی ہنگامہ سودا نہیں، معاف فرمایئے! آپ کی اپنی سوسائٹی بھی اب ایسے لوگوں سے خالی ہے، جن کا ذکر آپ کی کتاب کر رہی ہے۔ چونکہ تاریخی لحاظ سے بھی قرآن کا پایہ اپنوں بیگانوں کے نزدیک کافی معتبر ہے اس لئے یقین کرنا پڑتا ہے کہ ایسے معیاری انسان ضرور ہو چکے ہوں گے نیکیوں کے جن اعلیٰ نتائج کی قرآن نے خوشخبری دی ہے اور جس خدا سے ملنے کی امید دلائی ہے اس کی بے نظیر محبوبیت بہت زیادہ دلکش پیرائے میں بیان کی گئی ہے اور ہر ہر بات پر حتمی اور قطعی ہونے کی مہر بھی ساتھ ہی ساتھ لگتی گئی ہے۔

خیر اس قسم کی بہت سی باتیں ہیں جو اسلام کی طرف کھینچتی ہیں، لیکن اس سے بہت زیادہ مقدار ان باتوں کی ہے جو سوچ کے گہرے سمندر میں ڈال دیتی ہیں۔ آخر میں نے اپنی معاملاتی زندگی میں مسلمانوں کے ہر طبقے کو بہت نزدیک ہو کر دیکھا ہے، ان کے آپس کے جھگڑوں سے بھی ایک حد تک واقف ہوں، مجھے بحث و مناظرہ سے بھی دلچسپی رہی ہے، اور جن جن باتوں پر یہ ایک دوسرے کو کافر بے دین وغیرہ کا خطاب دیتے رہے ہیں وہ بھی کچھ نہ کچھ مجھے معلوم ہی ہے۔ اور پھر مسلمانوں کے مختلف فرقے ایک دوسرے پر فتح پانے کیلئے بہت سی بڑی بڑی کتابوں کے حوالے دیتے ہیں۔ اگرچہ قرآن میں ان کتابوں کا کہیں نام یا اشارہ بھی نہیں آیا، لیکن صدیوں سے مسلمان ان کو قرآن کے ساتھ ساتھ اپنے دھرم کی بنیاد کے طور پر مانتے چلے آرہے ہیں۔ پھر انہی میں سے ہر فرقہ اپنے عقیدہ و عمل کی حمایت اور دوسروں کی مخالفت کیلئے دلیلیں نکال لیتا ہے۔ اور پھر یہ ذخیرہ ایسا ہے کہ ہر صاحب قلم مولوی اس میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتا رہتا ہے، اس طرح ایک طرف تو آپ کا دین پھیل کر وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے، دوسری طرف ہر ہونہار مولوی کی امت ایک نئے فرقے کے روپ میں نمودار ہوتی ہے، ہمارے ہمسایہ ضلع گورداسپور کے دیہاتی مولوی مرزا غلام احمد صاحب نے کتنی ہی بڑی چھوٹی کتابیں بنائیں اور کتنے نئے مسئلے ایجاد کئے اور اس طرح ایک نئی امت تیار کر دی۔ اب سنا ہے ان کے مریدوں نے الگ الگ کتابیں بنا کر اس امت میں بھی کئی امتیں بنا لی ہیں۔ اسی پر قیاس کر لو کہ گذشتہ تیرہ صدیوں میں کتنے بڑے بڑے ملا ہوئے ہوں گے۔ اور انھوں نے بڑی بڑی پستکیں لکھی ہوں گی۔ اب اگر وہ ساری پستکیں آپ کا "دین" ہیں تو میں ہزاروں سال کی عمر اور ہزاروں آدمیوں کا دماغ کہاں سے لاؤں کہ سب کو جیا کروں، پھر پڑھوں، پھر سمجھوں اور ان کے متضاد حکموں پر عمل کرنے کے لئے مدتوں سوچتا رہوں کہ کس کو مانوں اور کس کو چھوڑوں۔ میں نے آپ کی زبان سے کئی دفعہ سنا ہے کہ آپ کے ہاں علم تفسیر کی کئی شاخیں ہیں، علم حدیث کی تحقیق کے لئے کئی علم ایجاد ہوئے، فقہ کے کئی اسکول ہیں، تصوف کے کئی خاندان ہیں پھر ہر ہر شاخ اور ہر ہر شعبے میں لاکھوں کتابیں تصنیف ہو چکی ہیں اور اس سارے کو آپ لوگ "دین" یا "مذہب" کہتے ہیں۔ یہ چیز مجھے پیچھے کی طرف دھکیلتی ہے اور حیران کر دیتی ہے۔ وہ آپکے الہ آباد والے اکبر صاحب جن کے شعر سنا سنا کر آپ مجھے ہنسایا کرتے ہیں کیسی مزے کی بات کہہ گئے ہیں۔

یہ صندوقِ کتب اب مجھ سے یارب اٹھ نہیں سکتا
یہ مذہب ہے تو مجھ سے بارِ مذہب اٹھ نہیں سکتا

معاف فرمایئے جس "بارِ مذہب" کو آپ کا اکبر حسین اکبر اٹھانے سے انکار کر رہا ہے اسے مہاشہ ہری چند گھڑی ساز کس طرح اٹھا سکے گا۔ کیا یہی وہ اسلام ہے جسے آپ ساری دنیا کے سامنے پیش کر کے امید رکھتے ہیں کہ موجودہ زمانے کی مختصر پسند اور وضاحت طلب دنیا اس پر ایمان لے آئے گی؟ معاف فرمایئے جتنا قرآن شریف غیر مسلموں کو اپنی طرف کھینچ سکتا ہے، اس سے زیادہ آپ کی درمیانی تاریخ اور موجودہ طرز زندگی اسلام سے دور باش کا نعرہ لگا رہی ہے۔ خدارا پہلے آپ سب مل کر اپنا کوئی اسلام متعین کریں پھر کسی اور کو اس کی طرف بلائیں۔ چونکہ آپ سے بے تکلفی ہے، اس لئے صاف صاف عرض کر رہا ہوں اور آپ کی فراخدلی سے

امید بھی ہے کہ آپ برا نہیں منائیں گے۔

معاف فرمائیں، خط طویل ہوگیا، لیکن اس طوالت کے ذمہ دار آپ ہی ہیں۔ پہلے آپ نے بات چھیڑی اور قرآن پر میری رائے دریافت کی، اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں ایک شخص کو دوست بھی کہوں اور اس کے ساتھ بات بھی پیچ دار کروں۔

(مہاشہ) ہری چند گھڑی ساز، مغل گیٹ امرتسر

جواب مہاشہ جی! اس میں ناراضگی کی کیا بات ہے آپ نے اپنے علم و خبر کے مطابق جو صحیح سمجھا لکھ دیا۔ اب میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں کہ آپ کو مثال کے ذریعے ایک بات سمجھاؤں۔

آپ کو یاد ہوگا جب ہم پہلی مرتبہ کشمیر گئے ہیں تو ہمارا قافلہ پیر پنجال کی بلند چوٹی سے پار اتر کر دامنِ کوہ میں چشمہ دیری ناگ کے مقام پر ٹھہرا۔ ہم نے وہاں آٹھ دن قیام کیا — آہ! وہ بھی کیا دن تھے۔

جوانی کی راتیں، امنگوں کے دن

چشمے کا شش پہلو یا شاید ہشت پہلو حوض جو شاہجہاں کے زمانے میں بنایا گیا تھا، جب ہم اس کے کنارے پر بیٹھتے تھے تو اس کے بے حد شفاف پانی میں نہ کی سنہری مچھلیاں کس طرح کلولیں کرتی اور پھدکتی ہوئی صاف دکھائی دیتی تھیں۔ پھر ایک چھوٹی سی پختہ نہر کے ذریعہ وہ پانی اپنے منبع سے نکل کر گرم سفر ہو جاتا ہے۔ اسی نہر سے چھوٹی چھوٹی نالیاں نکل کر اس بستی میں پھر گئی ہیں جو چشمے کی ہمنام ہے یعنی دیری ناگ کہلاتی ہے۔ پانی اتنا یخ کہ ہم نہانے بیٹھے تو تین گڑویوں سے زیادہ سر پر نہ ڈال سکتے تھے اور پینا چاہتے تو چائے کی طرح ایک ایک گھونٹ ٹھہر ٹھہر کر پیتے۔ اتنا صاف، شفاف اور سرد پانی آپ نے سمجھا کس وجہ سے ہے؟ منبع کے قریب ہونے کی وجہ سے — یہ منبع ہے دریائے جہلم کا — یہاں سے روانہ ہو کر کئی منزلیں طے کر کے، راستے کے کئی دیہات کی غلاظت اور اِدھر اُدھر کے بھلے بُرے پانیوں کو ساتھ لیتا ہوا جب یہ سری نگر میں پہنچتا ہے تو اس میں نہ وہ شفافی اور نہ ٹھنڈک، نہ یہ نہانے کے کام کا نہ پینے کے لائق۔ اس کو اس سے کوئی نسبت ہی معلوم نہیں ہوتی۔ وہ حور یہ چڑیل، وہ فرشتہ یہ دیو، کشمیر کی ناتربیت یافتہ آبادی نے اس کے کناروں کو نجاست سے لت پت کر رکھا ہے۔

بس ہر دین یا دھرم کو اسی پر قیاس کر لیجئے، اس کا آغاز خالص ربانی ہوتا ہے، پھر وقت گذرنے پر آہستہ آہستہ اس میں انسانی آمیزشیں شامل ہوتی جاتی ہیں یہانتک کہ ایک ایسا وقت آتا ہے کہ وہ اپنے اصل سرچشمہ سے دوری کے سبب[1] اپنی تمام تاثیر و لطافت کھو بیٹھتا ہے، پھر اس کے اولیں مخاطب اگر دنیا میں دوبارہ زندہ ہو کر اس کی آخری مسخ شدہ شکل کو دیکھیں تو بالکل نہ پہچان سکیں کہ یہ وہی پاک تعلیم ہے، جس نے ناپاکوں کو پاک اور محکوموں کو حاکم بنا دیا تھا۔

ہاں مہاشہ صاحب! یہاں ایک خاص بات کہنے کی یہ ہے کہ اسلام کے سوا باقی تمام دینی تعلیمات اپنی اصل کو کھو بیٹھی ہیں۔

---

[1] صرف دوری کے سبب نہیں بلکہ ان کثافتوں کے سبب جو اس میں مل جاتی ہیں۔ (طلوع اسلام)

یعنی ان کا منبع ہی موجود نہیں رہا۔ لیکن اسلام کا سرچشمہ قرآن کی شکل میں بالکل محفوظ ہے، یہ کوئی اتفاقی خوش بختی نہیں، خود قرآن کے اندر ایسی کئی آیات موجود ہیں، جن میں یہ پیش گوئی صاف طور پر ملتی ہے کہ قرآن کو ہمیشہ کیلئے خدائی حفاظت کا شرف حاصل رہے گا اور اس میں باطل کسی راہ سے نہیں گھس سکے گا۔ چنانچہ کتابی صورت کے علاوہ بے شمار انسانی سینوں میں بھی اس کی حفاظت ہو رہی ہے اور مخاطبین اول کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن کے نسخے اب تک موجود ہیں۔ پھر اس کی آیات، الفاظ، حروف، نقطے اور زیر زبر تک لگی ہوئی ہیں، بالکل معلوم ہے کہ اس میں الف کتنی مرتبہ آیا اور ب کتنی مرتبہ، اسی طرح تمام حروف کی گنتی محفوظ ہے۔ دوسری آسمانی کتابوں کے متعلق آپ کو علم ہے کہ ان کی اصلی بولی بھی نہیں ملتی۔ ترجمہ در ترجمہ کی شکل میں انسانی آمیزشوں کے ساتھ بعض صحیفے موجود ہیں اور ویدکی تو زبان بھی کہیں مروج نہیں، ان کو پوری طرح جاننے والا کوئی ودوان (علامہ) موجود نہیں۔

الحاصل یہ شرف صرف قرآن شریف کو حاصل ہے کہ اس کی بولی دنیا کے کثیر حصے میں بولی جاتی ہے اور اس میں اخبارات بھی نکل رہے ہیں، تصانیف بھی شائع ہو رہی ہیں، اور اعلیٰ اعلیٰ ڈکشنریاں بھی ملتی ہیں۔

اب میں نہایت ہی صاف الفاظ میں آپ سے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ جن کتابوں کو ہمارے ودوانوں (علاموں) نے دین بنا کر پیش کیا ہے اور اس کی بیشمار مختلف و متضاد شکلیں ہمارے بے شمار فرقوں کے اندر چلی آ رہی ہیں، وہ دین ہے ہی نہیں۔ دین سارے کا سارا قرآن کے اندر موجود ہے۔ یہ میں مدعی سست اور گواہ چست کے طور پر نہیں کہتا۔ خود قرآن بڑی ہی بلند آواز سے پکار رہا ہے۔ پانچویں سورت کی چوتھی آیت میں لکھا ہے:-

آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا

اور

اپنی نعمت تم پر پوری کر دی

اور

دین اسلام کو میں نے تمہارے لئے پسند کیا

حیاشہ صاحب! اس سے زیادہ واضح اور کیا ہوگا کہ وہ دین جو الٰہی نعمت ہے اور وہ نعمت دین کی شکل میں نازل ہوئی تھی اس کی تکمیل نزول قرآن پر ہو چکی اور وہ دین کونسا دین ہے؟ خالص اسلام۔ بس اس کے بعد جو فرقے، جو مذاہب اور جو کتابیں ہیں وہ اس دین اور اس نعمت سے خارج ہیں جس کی تکمیل قرآن کے اندر ہو چکی ہے۔

پھر چھٹی سورت کی ۱۱۶ ویں آیت میں ہے "تیرے رب کی بات سچائی اور انصاف میں کمال کو پہنچ گئی۔ اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں، وہ سننے والا جاننے والا ہے"۔

سچ اور انصاف ترازو کے پورے تول کو کہتے ہیں، جس میں ذرا بھی کمی یا بیشی ہو جائے تو وہ جھوٹ اور ظلم بن جاتا ہے۔

اس سے اگلی آیت میں ہے:۔

اگر تو زمین کے اکثر باشندوں کی بات ماننے لگے تو وہ تجھ کو راہ سے بے راہ کر دیں گے (کیونکہ یقین تو ان کے پلے میں ہے نہیں) وہ صرف ظن و تخمین کے پیچھے لگ رہے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسانی تصانیف اپنے زمان و ماحول کے بے شمار اختلافات کی وجہ سے کوئی یقینی اور ابدی تعلیم پیش نہیں کر سکتیں۔ مہاشہ جی! اس وقت مسلم ہوں یا غیر مسلم، سب ہی انسانی رہنمائی پر انحصار کر چکے ہیں۔ اور یہ رہنمائی قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی اور بدلتی جا رہی ہے، اور اگر کوئی قوم اسے نہ بدلنے پر مصر ہو تو جمود کا شکار ہونے سے نہیں بچ سکتی۔

دو گونہ رنج و عذاب است جان مجنوں را بلائے صحبتِ لیلا و فرقتِ لیلا

یعنی چلیں تو ٹھوکر اور کھڑے ہوں تو جمود۔ یقین کیجئے کہ جب تک عقل کی لگام وحی کے ہاتھ میں نہ دی جائے گی، انسانیت کو چین نہیں ملے گا، اور خالص وحی اس وقت قرآن کے سوا زمین کے تختے پر موجود نہیں۔

اور یہ جو آپ نے ہمارے فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ کو دین کی راہ میں ایک مشکلات کا پہاڑ سمجھا ہے۔ محترم! اصل بات یہ نہیں۔ یہ اپنے اپنے زمانے کی دین فہمی کی کوششیں ہیں، جن میں خلوص بھی ہے اور عدم خلوص بھی، خطا بھی ہے اور صواب بھی، ان میں سے کسی کو ہدایت کا درجہ حاصل نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انسان کی صورت پرستی بتوں کو بھی ابدی خدا کی گدی پر بٹھاتی رہی ہے، لیکن ایسا کرنے سے پتھر کی ماہیت تو تبدیل نہیں ہو جاتی۔ درحقیقت دھرم یا دین کوئی ایسی گپت ودیا نہیں جس کو بمشکل تمام کاشی کا ایک آدھ پنڈت یا یروشلم کا کوئی پادری یا ازہر و دیوبند کا کوئی فقیہ ہی سمجھ سکے اور باقی تمام دنیا کے لوگ اس ہونٹ اور رسٹ تک پہنچ ہی نہ سکیں، کیا آپ قدرت کا عام رویہ نہیں دیکھتے جتنی کسی چیز کی زیادہ ضرورت ہے، اتنی ہی اس کی پیداوار میں بھی فراوانی ہے۔

سرمایۂ حیات بود آب و بے بہاست مستلزم ممات بود زہر و قیمتی است

اگر دین تمام انسانوں کے لئے ہے تو وہ ایسا ہونا چاہئے کہ تمام انسانوں کے لئے سہل الحصول اور سہل الفہم ہو جب ہم اس نظر سے دین کو تلاش کرنے نکلتے ہیں تو بیشک بڑی بڑی پستیاں اور عظیم مجلدات ہمارے سامنے سد سکندری بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ سچ مچ کوہ ہے جو اس دیوار بلند و سنگین کو توڑ کے پھاندے اور دین تک پہنچ سکے۔ لیکن آپ نے دیکھا ہو گا، قرآن کا دین تو قطعاً ایسا پر پیچ اور پھیلا ہوا نہیں کہ سمجھا اور سمیٹا ہی نہ جا سکے۔ دوسری ہی سورت کی ۲۸۷ ویں آیت میں ہے:۔

"اللہ کسی بھی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا"

اور سنئے ۲۳ ویں سورت کی ۷۸ ویں آیت میں ہے:۔

"دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی"

مہاشہ جی! اس سے زیادہ تنگی اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسان "صرو شام اور عراق و عرب سے "دین کی کتابیں" تلاش کرتا پھرے اور اس میں عمریں صرف ہو جائیں، پھر بھی بات پلے نہ پڑے!

آخر یہ ایک خط ہی تو ہے جس کو میں طول دیتا جا رہا ہوں۔ لیکن کیا کروں، قرآن کے جن گوشوں کی طرف آپ کی نظر نہیں گئی، بلکہ بسیار مسلمانوں سے بھی وہ اوجھل ہی رہے، ان کو سامنے نہ لاؤں تو حقیقت کس طرح کھلے۔ قرآن کی بے شمار خوبیوں میں سے یہ بھی ایک خاص خوبی ہے کہ وہ اپنی ہر بات اس طرح بہ تکرار بیان کرتا ہے کہ بات تشنہ نہ رہ جائے اور سارے گوشے سامنے آجائیں اور کسی خارجی مفسر کی محتاجی نہ رہے، چنانچہ اس مضمون کی صرف ایک آیت اور سن لیجئے جو دوسری سورت کے ۱۸۵ نمبر پر آئی ہے۔

اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہارے لئے تنگی نہیں چاہتا۔

دیکھا آپ نے ہوا اور پانی کی حیات بخشیوں کی طرح دین کتنا سہل اور رواں دواں ہے جس کی راہ میں کوئی مشکل ہی نہیں —— قرآن کی ایک خصوصیت اور بھی ہے اور وہ یہ کہ جو تعلیم وہ پوری کی پوری کتاب میں دیتا ہے اسی کو اصولی طور پر مختصر سے مختصر انداز میں چند جملوں میں بھی دہرا دیتا ہے تاکہ پھیلی ہوئی بات سمٹ کر بھی سامنے آتی رہے اور اس طرح جزو میں کل کا تماشا دکھائی دیتا رہے۔ مثال کے طور پر ایک بہت ہی چھوٹی سی سورۃ سن لو جس کے صرف ایک چھوٹے سے فقرے میں سارا دین آگیا ہے فرماتے ہیں:-

زمانہ گواہی دے رہا ہے کہ انسان نقصان میں ہے (ہاں اس لازمی نقصان سے کون لوگ بچ سکتے ہیں) صرف وہی جو ایماندار اور نیکوکار ہیں اور راست بازی کی تعلیم کو عام کرتے ہیں اور (اس راہ میں جو مشکلات آئیں ان پر) مل جل کر صبر کرتے اور ثابت قدم رہتے ہیں۔

بس یہ چار باتیں ہیں، جن میں میری، آپ کی اور تمام دنیا کی مشکلات کا حل ہے۔ اگر ہم اس قسم کی سوسائٹی بنانے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ دنیا جنت بن سکتی ہے —— حاشا جی! یہ صرف زبانی بات نہیں۔ تاریخ کے ایک روشن دور میں کچھ لوگوں نے اس تعلیم کو اپنایا اور تجربی حقیقت ثابت کر دکھایا۔

عربی میں اس سورۃ کی تین آیتیں ہیں۔ پہلی ایک لفظ کی، دوسری دو لفظوں کی اور تیسری سات لفظوں کی۔ بس ان سات لفظوں میں سب کچھ آگیا۔ ہمارے مشہور عالم مولانا عثمانیؒ نے اس سورہ کے حاشیے پر لکھا ہے:-

فی الحقیقت یہ چھوٹی سی سورت سارے دین و حکمت کا خلاصہ ہے، امام شافعیؒ نے سچ فرمایا کہ اگر قرآن میں صرف یہی ایک سورت نازل کر دی جاتی تو (سمجھ دار بندوں کی) ہدایت کے لئے کافی تھی۔ بزرگان سلف میں جب دو مسلمان آپس میں ملتے تھے، جدا ہونے سے پہلے ایک دوسرے کو یہ سورت سنایا کرتے تھے۔

یہ صرف ایک نمونہ ہے۔ اس قسم کی بیسیوں آیتیں ہیں۔ کہیں دو کہیں تین، کہیں چار اور کہیں صرف ایک ہی آیت میں دین کی حقیقت بیان کر دی ہے۔

دیباچۂ قرآن جس کو سورۂ فاتحہ، متن قرآن اور ام الکتاب وغیرہ کئی ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے، اس کی کل سات آیتیں ہیں۔ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ سارے قرآن کا اصل و مغز ہے اور قرآن اس کی تفصیل و تفسیر ہے۔

۵۴ ویں سورت میں ایک ہی بات کو بار بار چار دفعہ دہرایا ہے کہ

یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کے لئے آسان کر دیا ہے تو کیا ہے کوئی نصیحت لینے والا؟

یعنی جہاں تک نصیحت کا تعلق ہے قرآن آسان ہے اس میں کوئی ایچ پیچ نہیں۔ ۳۹ ویں سورت کی آیت ۲۷ و ۲۸ میں ہے :-

ہم نے اس قرآن میں ہر طرح کی مثالیں بیان کر دیں تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ قرآن عربی جس میں کوئی ٹیڑھا پن نہیں تاکہ لوگ تقویٰ شعار بن جائیں۔

مہاشہ جی! میں نے بھی قریب قریب تمام ممکن الحصول سماوی کتابیں دیکھی ہیں۔ اتنی صفائی سے اپنا تعارف خود کرانے والی کوئی کتاب نظر نہیں آئی جتنا قرآن۔ یہ ابھی جمال قرآنی کے ایک گوشے کی یونہی ذرا سی شعاع ہے۔ تفصیلات میں جانے کی نہ مجھ میں تاب، نہ آپ کو گنجائش۔ بات بڑھتی جا رہی ہے لیکن خاتمے سے پہلے ایک نکتے کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ قرآن صرف یہی نہیں ہے کہ

خیرے کن اے فلاں وغنیمت شمار عمر | زاں پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نماند (سعدی)

پند حافظ شنو اے دوست بر دنیکی کن | کہ من ایں پند بہ از دُرّ و گہر می بینم (حافظ)

یعنی خالی وعظ و نصیحت یا اپدیش نہیں بلکہ یہ ایک عملی پروگرام دیتا ہے جس سے وہ تمام رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں جن کی وجہ سے انسان وعظ اور نصیحت پر عمل نہیں کر سکتا۔ ان رکاوٹوں کو قرآن کی زبان میں ابلیس و شیطان کہا گیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ہر شخص کی رکاوٹیں جداگانہ ہوں گی اور اسی طرح ہر قوم کی اور ہر زمانے کی جدا۔ یعنی قرآن کی اصطلاح میں ہر شخص کا شیطان دوسرے شخص سے مختلف ہے۔ اور ہر زمانے اور ہر قوم کا شیطان الگ الگ اسلحہ سے مسلح ہوتا ہے۔ ان تمام باریکیوں پر نگاہ رکھنا کسی ایک زمانے اور ایک ماحول کے پلے ہوئے انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ کام بھی قرآن ہی کو کرنا تھا، چنانچہ اس نے کیا اور خوب کیا۔ اور اس قسم کے علوم و شواہد بھی اپنے اندر جمع کر دیئے ہیں جو ایک طرف ایک عامی کے لئے اطمینان کا باعث بن جائیں، اور دوسری طرف ایک بڑے سے بڑے صاحب فکر کے قلب اور دماغ کی الجھنوں کو بھی صاف کرتے جائیں۔ جو ہزار سال پہلے کی دنیا کے مسائل اور مشکلات کا حل بھی پیش کر دیں اور جو آج کی پیچ در پیچ دنیا کے دکھوں کا علاج بھی بتا دیں۔ یہ ہے قرآن کا کام جسے کوئی انسانی عقل سرانجام نہیں دے سکتی۔ اور جب کیفیت یہ ہے تو پھر انسانی دماغوں کی بنائی ہوئی پتلیاں (خواہ ان کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے) کس طرح سے قرآن کی جگہ دین بن سکتی ہیں؟ لہٰذا میں آپ کو بھی مشورہ دونگا کہ آپ دین اسلام کو سمجھنے کیلئے قرآن پر قناعت کریں اور قرآن ہی پر اپنی تمام تحقیق و تلاش کا انحصار رکھیں۔ اور جو وہ کہتا ہے، اس پر عمل کریں۔ پھر دیکھیں وہ آپ کو کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ میری قوم کی اکثریت ابھی اس لطف سے محروم ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کے ساتھ غیر قرآنی آمیزشوں سے سری نگر کا دریائے جہلم بن رہی ہے جس سے ہر ذوق سلیم رکھنے والا دور رہنے کی کوشش کرے۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے اور اس خط کی رسید جلدی دیں گے۔

عرشی

نقد و نظر

۱۔ موجِ کوثر

غدر سے کچھ پہلے سے لیکر تشکیلِ پاکستان تک کا عرصہ، مسلمانانِ ہندوستان کیلئے بڑا پُر آشوب، صبر آزما بلکہ یوں کہئے کہ گہوارۂ بیم و رجا تھا۔ ایک طرف حالات کی نامساعدت پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ وہ قوم جس نے یہاں ایک ہزار سال تک اس دبدبہ اور طنطنہ سے حکومت کی تھی، ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائے گی۔ دوسری طرف، اسی مٹنے والی قوم کی راکھ کے ڈھیر کے نیچے ایسی دبی ہوئی چنگاریاں دکھائی دیتی تھیں جن سے بار بار یہ توقع بندھتی تھی کہ انھیں ذرا بھی ابھرنے کا موقعہ مل گیا تو یہ مخالفتوں کے خس و خاشاک کو جلا کر رکھ دیں گی۔ اس دور کی تاریخ ہمارے لئے عبرت و موعظت اور بصیرت و حکمت کے ہزار سامان اپنے اندر رکھتی ہے لیکن افسوس کہ اس وقت تک اس قسم کی کوئی جامع تاریخ مرتب نہیں ہوئی جس میں ان سیاسی اور ذہنی تحریکات کا مفصل تذکرہ موجود ہو جو اس صد سالہ عہدِ کشمکش میں ہماری نشاۃِ ثانیہ کا پس منظر بنیں۔ ہمارے شیخ محمد اکرام صاحب (ایم۔ اے۔ بی۔ ایس) مستحقِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس کوشش کی ابتدا کی ہے اور اپنی تالیف "موجِ کوثر" میں (جس کا دوسرا ایڈیشن ابھی چھپکر سامنے آیا ہے) ان اہم تحریکات کا تعارف کرایا ہے جو بتدریج تشکیلِ پاکستان تک منتج ہوئیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایسے اہم دور کی تفصیلی تاریخ کے مقابلہ میں اس تعارف کو اجمالی کہا جائے گا لیکن انھوں نے اس اجمال میں بھی اچھی خاصی تفاصیل کو سمو دیا ہے۔ اکرام صاحب میں ایک خصوصیت ہے اور وہ ہے تفحص اور تجسس کی عادت۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی اہم عنوان ان کے پیشِ نظر ہوتا ہے تو ان کی نگاہ ہر وقت مصروفِ تجسس رہتی ہے اور ان کونوں اور کھدروں سے معلومات فراہم کرلیتی ہے جو عام طور پر دوسرے لوگوں کے خیال میں بھی نہ آسکیں۔ آپ کو ان کے نتائج مستخرجہ سے اختلاف ہوسکتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ ان کی رائے سے متفق نہ ہوں لیکن وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں جس محنت سے شہادات فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں آپ اس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اکرام صاحب ہمارے عہد کے ایک اچھے مولف ہیں اور "مولف" میں یہی خوبی ہونی چاہئے۔

موجِ کوثر میں حضرت سید احمد بریلویؒ اور ان کی تحریک جہاد، سر سید احمد خاں اور ان کی تحریک علی گڈھ، تحریکِ مرزائیت، تحریک علی گڈھ کے ردعمل میں اکبر، شبلی، ابوالکلام آزاد کی مساعی، گلکدۂ پاکستان کے طائرِ پیش رس، اقبالؒ اور سب سے آخر عبیداللہ صاحب سندھی کے کوائف و تذکار بڑی محنت سے جمع کئے گئے ہیں۔ اس ساری کوشش میں نقطۂ ماسکہ، سر سید کی شخصیت اور تحریک ہے اور اس کے ردعمل میں بطور زنگارِ آئینہ، شبلی اور (ان کے جانشین) سید سلیمان ندوی کا بے نقاب تعارف۔ حقیقت یہ ہے کہ ہنگامہ پروری اور غوغا آرائی کے خوگر مسلمان نے ابھی تک سر سید کے صحیح مقام کو نہیں پہچانا اسی لئے اس کی عظمت عام طور پر نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ اقبال سے پہلے (کہ جس کا مقام ہی الگ ہے) ہماری اس صد سالہ تاریخ میں سر سید کے مقابل کسی اور شخصیت کو

بمشکل پیش کیا جا سکتا ہے جس نے ایسا تعمیری کام کیا ہو۔ قوم کے جذبات کو ابھارنے والے اور اس کی قوتوں کو بگولوں کے رقص میں تبدیل کر دینے والے تو بہت ملیں گے لیکن مستقبل کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد، قوم کو، زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دینے کے قابل بنا دینے کا تعمیری کام سرسید کے سوا اور کس نے کیا ہے؟ سرسید کو اس صد سالہ دور سے نکال دیجئے اور پھر دیکھئے کہ ہندوستان کا مسلمان آج کس حالت میں ہوتا؟ مقام مسرت ہے کہ اکرام صاحب نے قوم کو سرسید کے صحیح مقام اور کیریکٹر سے متعارف کرانے کی سعی محمود فرمائی ہے[1]۔ اس کے ساتھ ہی جب ردِ عمل کی تحریک کے سلسلہ میں شبلی اور سید سلیمان ندوی کا ذکر آیا ہے تو ان کی سیرت اور ذہنی رجحانات و قلبی امیال و عواطف کے نفسیاتی تجزیہ میں بھی انھوں نے خاصی دقتِ نظر سے کام لیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ تصویر کا دوسرا رخ پیش کرنے میں کتاب کا یہ حصہ سب سے کامیاب ہے۔ البتہ ایک مقام پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جناب مولف کو سید سلیمان ندوی صاحب سے غالباً محض کتابی تعارف حاصل ہے ان سے کبھی معاملہ نہیں پڑا۔ ورنہ ان کی نگاہ اس قسم کی غلطی نہ کرتی کہ "سید صاحب کی دوسری خوبی ان کی علمی شرافت اور وسیع القلبی ہے"۔ جن لوگوں کو سید صاحب سے معاملہ پڑا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کی سب سے بڑی کمزوری ان کی قدامت پرستی اور ذہنی جمود نہیں بلکہ ان کی انتہا درجے کی تنگ نظری اور علمی حسد ہے۔ بہرحال شبلی اور سید صاحب کے تجزیہ سے محترم مولف نے ان محرکات کی طرف راہ نمائی کر دی ہے جو ہندوستان میں رجعت پسندانہ "دقیانوسیت" کے استحکام کو ایک مقدس مذہبی خدمت کی شکل میں پیش کرنے کا موجب بنے اور جن کے تباہ کن اثرات سے قوم اس وقت تک نہیں سکی۔

کتاب کا سب سے کمزور حصہ وہ ہے جو تحریک مرزائیت سے متعلق ہے۔ اس میں شبہ نہیں (جیسا کہ ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا) بعض اور مقامات بھی ایسے ہیں جہاں مولف کی رائے صائب نہیں نظر آتی لیکن تحریک مرزائیت کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس باب میں ان کی نگاہ کسقدر سطحی بن کر رہ گئی ہے! سب سے پہلے تو یہ کہ یہ حقیقت اب ارباب بصیرت سے پوشیدہ نہیں کہ قادیانی تحریک ایک مذہبی تحریک تھی ہی نہیں۔ اس لئے اسے اس حیثیت سے پیش کرنا بنیادی غلطی ہے۔ یہ تحریک درحقیقت ردِ عمل تھی اس تحریک جہاد کا جسے اُس زمانے میں "وہابی تحریک" کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ انگریز اس تحریک سے بیحد خائف تھا اور چاہتا تھا کہ جہاں اس نے مسلمانوں کے ہاتھ سے تلوار چھینی ہے، ان کے دماغ سے جہاد اور اسلامی حکومت کے قیام کا خیال بھی نکال دیا جائے۔ چونکہ مسلمانوں کے ذہن میں عام طور پر جہاد اور اسلامی حکومت کا تصور مہدی کے تصور کے ساتھ وابستہ تھا اسلئے انگریز کی حکمت عملی نے مسلمانوں کو ایک ایسا "مہدی اور پیغمبر" دیدیا جس نے اس کے اس مقصد کو نہایت عمدگی سے پورا کرنے کی کوشش کی۔

---

[1] ہمیں معلوم ہوا ہے کہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر عبدالمجید صاحب نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے سرسید پر ایک تحقیقاتی مقالہ لکھا ہے۔ اس مقالہ کے بعض اجزا پچھلے سال روزنامہ امروز میں شائع ہوئے تھے جن سے مترشح ہوتا تھا کہ یہ مقالہ اس کمی کو بڑی حد تک پورا کر دے گا جو اس باب میں اس وقت تک محسوس ہو رہی ہے۔

وہ تو یہ کہئے کہ فطرت کو ہنوز مسلمانانِ ہند کی زندگی مقصود تھی جوان میں اقبال پیدا ہوگیا ورنہ انگریز کے اس "خود کاشتہ پودے" کے برگِ حشیش نے تو وہ رنگ جمایا تھا کہ سادہ لوح مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوجاتا۔ لہٰذا یہ تحریک ایک خالص سیاسی تحریک تھی جس نے محض مذہب کا نقاب اوڑھ رکھا تھا۔ یہی اس تحریک کا صحیح تعارف ہے[1]۔ اور اسے اسی حیثیت سے پیش کیا جانا چاہئے تھا۔

اس غلط فہمی کی بنا پر کہ یہ تحریک ایک مذہبی تحریک تھی، فاضل مولف نے ان کی ان خدمات کو سراہا ہے جنہیں "اشاعتِ اسلام" کے حسین و دلکش پیرائے میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس باب میں بھی یہ اہم نقطہ مولف کی نگاہوں سے اوجھل رہ گیا ہے کہ "اشاعتِ اسلام" دو چار سو عیسائیوں کو مسلمان کر لینے، یا اپنے تصور کے مطابق انگریزی میں لٹریچر شائع کر دینے کا نام نہیں۔ اسلام نام ہے ایک آئینی نظام کا جسے الدین کہا جاتا ہے اور اس کی اشاعت کا اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں کہ اس نظام کو عملاً نافذ کیا جائے۔ جو تصورات اسلام کو دین (نظام زندگی) نہیں بلکہ مذہب (دھرم یا Religion) کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں ان کی اشاعت اسلام کی خدمت نہیں، اس کی مخالفت ہے۔ غیر مسلم قوتیں نہ صرف یہ کہ اس قسم کے "اسلام" کی آزادی ہی دیتی ہیں بلکہ ان کی نشر و اشاعت میں ممد و معاون بھی ہوتی ہیں کیونکہ اس سے حقیقی اسلام مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل رہ جاتا ہے۔ میرزائیت کی اشاعت اسلام (خواہ وہ لاہوری جماعت کی طرف سے ہو یا قادیانی گروہ کی طرف سے) اسی قسم کی اشاعتِ مذہب ہے جس سے قوم کو بری طرح سے فریب دیا جاتا ہے۔ حیرت ہے کہ اقبال سے اس قدر قریب رہنے کے باوجود، یہ اہم حقیقت بھی فاضل مولف کی نگاہوں سے پوشیدہ رہی اور انہوں نے بھی ان افیونی کوششوں کا نام "اشاعتِ اسلام" رکھ دیا جو انگریز کے اس "خود کاشتہ پودے" کے برگ و بار کا نتیجہ تھیں۔

اسی ضمن میں ایک چیز اور بھی ہے جسے سامنے لانا ضروری ہے۔ مولف نے میرزا صاحب کے دعاوی اور معتقدات پر تبصرہ کرتے ہوئے ایسا انداز اختیار کیا ہے گویا یورپ کا کوئی مستشرق نظری بحث (Academic discussion) کے بعد، محض ایک مبصر (Observer) کی حیثیت سے اپنی رائے پیش کر رہا ہو۔ مثلاً انہوں نے لکھا ہے:-

(میرزا صاحب نے) مسیح موعود، مہدی منتظر، اور کرشن اوتار ہونے کا دعویٰ کیا۔ اور یہ دعوے ایسے ہیں جن کو عام مسلمان غلط سمجھتے ہیں۔ نبوت کا دعویٰ کر کے اور ایک نیا فرقہ کھڑا کر کے انہوں نے مسلمانوں میں جو اختلاف پیدا کیا ہے اسے بھی اکثر مسلمان ناپسند کرتے ہیں۔

میرزا صاحب کے ان دعاوی کو عام مسلمان "غلط سمجھتے اور ناپسند کرتے ہیں"۔ لیکن سوال یہ ہے کہ خود مؤلف کا ان کے متعلق کیا خیال ہے؟ کیا وہ انہیں صحیح سمجھتے اور پسند کرتے ہیں؟ ایک مورخ کو یا تو محض وقائع نگار (Chronicle writer) ہونا چاہئے۔ اس صورت میں اسے واقعات پر تبصرہ یا رائے زنی نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن اگر وہ واقعات پر تبصرہ بھی کرتا ہے، اور اپنی رائے بھی دیتا ہے تو پھر اسے اپنی رائے نہایت حتم و یقین کے ساتھ پیش کرنی چاہئے۔ یہ کہہ کر آگے نہیں بڑھ جانا چاہئے کہ فلاں عقیدے کو عام مسلمان ایسا سمجھتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس کی وجہ غالباً مولف کی "صلح کل" پالیسی پر کاربند رہنے کی کوشش ہے، جسے وہ غیر جانبداری سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ حقیقت ان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہوگی کہ جب کوئی صاحب قلم تبصرہ نگاری اور تجزیۂ احوال و کوائف کے

---

[1] اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے "معراج انسانیت" کا آخری باب "ختم نبوت"۔

میدان میں اترتا ہے تو اس کے لئے "صلح کل" رہنا ناممکن ہو جاتا ہے اور اگر وہ بایں ہمہ ایسا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی تصنیف میں وہ قوت نہیں رہتی جو اپنی رائے کو ایمان و یقین کی بے باکانہ جرأتوں کے ساتھ پیش کرنے سے پیدا ہوتی ہے اور جو معتقدات کے بارے میں خاص طور پر ناگزیر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "موج کوثر" میں بعض مقامات پر عجیب قسم کے تضادات سامنے آجاتے ہیں۔ مثلاً ص۳۰۳ پر تحریر ہے کہ

علمی اور ذہنی نقطۂ نظر سے سید سلیمان ندوی میں کئی کمزوریاں ہیں۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آج وہ ہماری علمی مجلس کے صدر نشین ہیں تو قوم کے معیارِ علم کا خیال کر کے دل بیٹھ جاتا ہے۔

جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

لیکن ایک ہی ورق کے بعد ص۳۰۵ پر، یہ عبارت سامنے آجاتی ہے کہ

آج سید سلیمان ندوی ہماری علمی زندگی کے سب سے اونچے زینے پر ہیں۔ وہ عالم ہی نہیں امیر العلماء ہیں۔ مصنف ہی نہیں رئیس المصنفین ہیں۔ ان کا وجود علم و فضل کا دریا ہے جس سے سینکڑوں ندیاں نکلی ہیں اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہوئی ہیں۔

کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ دونوں تحریریں ایک ہی قلم سے ایک ہی وقت میں نکلی ہیں؟ ایک سانس میں یہ کہ "یہ دیکھ کر کہ سید صاحب ہماری علمی مجلس کے صدر نشیں ہیں، قوم کے معیارِ علم کا خیال کر کے دل بیٹھ جاتا ہے" اور دوسرے سانس میں یہ کہ "ان کا وجود علم و فضل کا دریا ہے جس سے سینکڑوں ندیاں نکلی ہیں اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہوئی ہیں"۔

ایک مقام پر لکھا ہے:۔

سچ تو یہ ہے کہ حالی کے بعد کسی نے اس اخلاقی تنزل کا صحیح اندازہ ہی نہیں کیا جو قدیم مذہبی نظام کی شکست و ریخت اور تصوف کے انحطاط کے بعد ہندوستانی مسلمانوں میں شروع ہوا اور آج بھی آزاد، اقبال اور مودودی کی مجددیت کے باوجود (یا اس کی وجہ سے) برابر بڑھ رہا ہے۔ (ص۳۲۷)

ہم نہیں سمجھ سکے کہ یہاں "مجددیت" کا لفظ طنزاً استعمال کیا گیا ہے یا بطور حقیقت۔ اگر طنزاً استعمال کیا گیا ہے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ذرا آگے چل کر اقبال کو "دورِ حاضر کا سب سے بڑا مذہبی مفکر" (ص۳۵۵) کیوں لکھا گیا ہے جس کا "سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اس نے توحید کے راز پارینہ سے پھر سے پردہ اٹھایا ہے" (ص۳۶۴) اور "توحید اسلامی عقائد کی جان ہے" (ص۳۵۸)۔ اور اگر "مجددیت" کا لفظ حقیقی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے تو کیا محترم اکرام صاحب، ابوالکلام صاحب آزاد، اور سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کو بھی ہمارے عہد کا مجدد سمجھتے ہیں اور انہیں اقبال کا ہم پایہ قرار دیتے ہیں؟

مجددیت کا لفظ طنزاً استعمال کیا گیا ہو یا حقیقتاً، اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ جناب مولف کے نزدیک، حالی کے بعد کسی نے بھی قوم کے اخلاقی تنزل کا صحیح اندازہ نہیں لگایا اور یہ تنزل اقبال کی مجددیت کے باوجود یا اس کی وجہ سے برابر بڑھ رہا ہے! لیکن اسی

اقبال کے متعلق چند صفحات آگے چل کر یہ تحریر بھی ملتی ہے کہ

یہ ہے اقبال کی تعلیمات کا خلاصہ۔ ان کے متعلق دو امور قابل ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان میں روحانی اور اخلاقی ترقی اور دینی اور دنیاوی فلاح کی وہ باتیں ہیں جن پر زمانہ حال میں ان کی اہمیت کے مطابق کسی نے زور نہیں دیا تھا۔ . . . . . اسلام کے روحانی امراض کے لئے اس نے جو نسخہ تجویز کیا ہے وہ جمہور علماء کے خیالات کے عین مطابق ہے۔ اسرار و رموز کا کوئی شعر ایسا نہیں جسے شاہ ولی اللہؒ یا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نہ لکھ سکتے ہوں۔ اور غالباً یہ کہنا صحیح ہے کہ اگرچہ اقبالؒ کی تعلیم مغربی ہے لیکن روحانی طور پر وہ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور خواجہ محمد معصومؒ کا جانشین ہے۔

جوہر میں ہو لا الٰہ تو کیا خوف ۔ تعلیم ہو گر فرنگیانہ (ص۴۱۳)

یہ ارشادات اسی اقبال کے متعلق ہیں جس کی بابت ابھی ابھی یہ کہا جا رہا تھا کہ اس کی مجددیت کی وجہ سے قوم میں اخلاقی تنزل برابر بڑھ رہا ہے! یہ عجیب تماشا ہے کہ اقبال، شاہ ولی اللہؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا ہم فکر، اور حضرت مجدد الف ثانیؒ اور خواجہ محمد معصومؒ کا جانشین بھی ہے اور اس کی "مجددیت" سے قوم میں اخلاقی تنزل بھی برابر بڑھ رہا ہے! اقبال بچارے کو تو چھوڑیئے سوچئے کہ جن اسلافِ کرام کا جانشین اس قسم کا ہو ان کے متعلق کیا رائے قائم کی جائے گی؟

اے عقل چہ می گوئی! اے عشق چہ فرمائی؟

یہیں تک بس نہیں۔ اس جانشینِ حضرت مجدد الف ثانیؒ و خواجہ محمد معصومؒ کے متعلق تو محترم مولف اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئے ہیں جہاں فرماتے ہیں کہ

اس سے بھی زیادہ نمایاں اختلاف وہ تھا جو زعمائے وقت کے ارشادات اور ان کی شخصی زندگی میں تھا۔ ہم نے اکبر کے ضمن میں اس امتیاز کو نمایاں کیا ہے جو بزم اکبر اور کلیاتِ اکبر کے اکبروں میں تھا۔ لیکن یہ دورخی صرف اکبر کے لئے مخصوص نہیں بلکہ اس باب میں جتنے بزرگوں کا ذکر ہوا ہے ان سب (اور اقبال) کے حالات میں نظر آتی ہے۔ شبلی تو اس معاملے میں اکبر سے بڑھے ہوئے تھے۔

اس "دورخی" کی وضاحت، شبلی سے متعلق ایک مثال سے کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

مولانا شبلی کے ایک بے تکلف دوست، مہدی حسن، جن کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے مولانا کو ایک خط میں لکھتے ہیں "بڑی مشکل یہ ہے کہ آپ فلسفۂ قدیم کے حامل ہیں۔ یعنی منہ پر کچھ اور دل میں کچھ اور میرے ہاں مقتضائے نفس اور شایانِ حال دونوں ایک چیز ہیں یعنی ہم لوگ کہیں سے لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ دل اور زبان گویا صرف ایک چیز کے دو نام ہیں۔ (ص۳۵)

اس سے واضح ہے کہ اکرام صاحب کے نزدیک اس دورخی، کا مفہوم، جس کے مرتکبین میں سے اقبال بھی تھا یہ ہے کہ منہ پر کچھ اور دل میں کچھ۔ فطری طور پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس شخص کی "دورخی" کا عالم یہ ہو کہ منہ پر کچھ اور دل میں کچھ، اور جس کی مجددیت کا نتیجہ یہ ہو کہ قوم میں اخلاقی تنزل بڑھتا چلا جائے، کیا ایسا شخص حضرت مجدد الف ثانیؒ اور خواجہ محمد معصومؒ کا روحانی جانشین بھی کہلا سکتا ہے؟

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اقبال کیا تھا اور اس کی مجددیت نے کیا کیا! سوال یہ ہے کہ محترم مؤلف کی ان دونوں میں سے کونسی رائے صحیح ہے؟

اس قسم کی متضاد اور غیر متوازن آرا نے کتاب کی حیثیت بڑی حد تک گرا دی ہے۔ ان امور سے صرفِ نظر کر لینے کے بعد کتاب کی افادی حیثیت اور مولف کی محنت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

کتاب میں ایک بات اور بھی کھٹکتی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن تقسیمِ ہند سے پہلے شائع ہوا تھا۔ موجودہ ایڈیشن، حک و اضافہ کے بعد، پاکستان میں شائع ہوا ہے۔ کتاب میں کئی ایک باتیں ایسی ہیں جو زمانہ قبل از تقسیم کے واقعات پر مبنی تھیں۔ لیکن تقسیمِ ہند کے بعد وہ حالات بدل چکے ہیں اس لئے ان باتوں کو علی حالہٖ نہیں رہنے دینا چاہئے۔ غالباً اس کی وجہ مؤلف کی عدیم الفرصتی ہے۔ آئندہ ایڈیشن میں اس کا خیال رکھنا چاہئے۔

کتاب، اردو بک سٹال، بیرون لوہاری دروازہ، لاہور کی طرف سے شائع ہوئی ہے جو چھوٹی تقطیع کے قریب ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ اور جلد معمولی ہے۔ قیمت فی جلد پانچ روپے۔

۲۔ کلیاتِ اکبر الہ آبادی

جلد اول

آنریبل چودھری نذیر احمد خاں صاحب وزیر تو ہیں شعبۂ صنعت و حرفت کے، جہاں احساسات و جذبات کے بجائے مشینوں سے کام پڑتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس میکانکی ماحول میں بھی اپنے ذوقِ لطیف کو زندہ اور تر و تازہ رکھا ہے۔

چو جوئے در کنارِ کوہسارے

انھوں نے پہلے مجلسِ اقبال قائم کی اور اربابِ مجلس نے انھیں اپنا صدر منتخب کیا۔ اس کے بعد انھوں نے بزمِ اکبر کو متشکل کیا اور اس کے صدر بھی آپ ہی ہیں۔ مجلسِ اقبال کی طرف سے "پیامِ مشرق" کا عربی ترجمہ شائع ہو چکا ہے (جس کا تعارف ان صفحات میں پہلے آ چکا ہے) اب بزمِ اکبر کی طرف سے کلیاتِ اکبر کی جلد اول شائع ہوئی ہے اور نہایت آب و تاب سے۔ کلیات کی ترتیب محمد واحدی صاحب کی ذہنی کاوش کی رہینِ منت ہے، جنھیں عام طور سے (غالباً خواجہ حسن نظامی صاحب کے عطا فرمودہ لقب کی جہت سے) مُلّا واحدی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ لیکن ان کا ذوقِ لطیف پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ان پر "مُلّا" کی تہمت ناحق ہے۔ کہاں مُلّا کہاں شعر!

سوزِ دل پروانہ کس را نذر ہند

کلیات (یعنی پورے کا پورا کلام) شائع کرنے کا فیصلہ غالباً بزم کی طرف سے ہوا ہوگا لیکن ہمارے نزدیک یہ فیصلہ کچھ مستحسن نہ تھا۔ کلیات کے بجائے انتخاب شائع کرنا زیادہ بہتر تھا۔ اکبر کا جو کلام عام طور پر زبان زدِ خلائق ہے اس کی بنا پر ذہنوں میں ان کا ایک

خاص مقام متعین ہو چکا ہے جس سے ان کی عظمتِ شعری وابستہ ہے۔ کلیات میں پختہ و خام، مبتدیانہ اور منتہیانہ ہر قسم کا کلام ہوتا ہے۔ اور چونکہ اکبر نے بہت چھوٹی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا (چنانچہ کلیات کی ابتدا سترہ سال کی عمر کے کلام سے ہوتی ہے) اس لئے کلام کا زیادہ حصہ خام اور مبتدیانہ ہے۔ علاوہ ازیں جس دور کا وہ کلام ہے خود اس دور میں غزل کا عام معیار بڑا پست اور سوقیانہ تھا۔ غالب جیسی شخصیتیں تو مستثنیات میں سے تھیں جو اپنے دور کو چیر کر بہت آگے نکل گئی تھیں، ورنہ اس زمانے میں دہلی پر ذوق کا رنگ غالب تھا اور لکھنؤ کا تو پوچھئے ہی نہیں۔ شعر نام تھا لفظی صنعت کاریوں کا۔ گرگابی گرگ اور آب کا مرکب ہے اور گرگ کہتے ہیں بھیڑیے کو۔ اور آب پانی کو۔ لہٰذا مصرع موزوں ہو گیا کہ

بھیڑیے پانی بھرے ہیں تیری گرگابی کا

اور اس لفظی تلازمہ پر چاروں طرف سے واہ واہ ہونے لگ گئی۔ اکبر اسی ماحول کا پروردہ تھا اس لئے اس کے ابتدائی کلام (بلکہ یوں کہئے کہ اس کی غزلوں) پر اس ماحول کا اثر ناگزیر تھا۔ اس رنگ کے اشعار میں نہ شعریت ہوتی تھی نہ ان کا کوئی مفہوم و مطلب ہی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج یہ رنگ نہ صرف یہ کہ مانوس نہیں رہا بلکہ ذوق لطیف پر اس قدر گراں گذرتا ہے کہ طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ کلیاتِ اکبر اس قسم کے اشعار سے بھری پڑی ہے (اور ایسا ہونا بھی چاہئے تھا کہ اس زمانے کا رنگ یہی تھا۔ اس میں اکبر کا کیا قصور!) مثلاً چند شعر ملاحظہ ہوں۔

(۱) دھیان میں لایا سر مو بھی نہ اس کی نازکی — کھل کے جوڑا خود سری سے تا کمر آہی گیا
(۲) شوقِ پا بوسیٔ جاناں مجھے باقی ہے ہنوز — گھاس جو اگتی ہے تربت پہ حنا ہوتی ہے
(۳) نہ کیونکر بوئے خوں نامے سے آئے — اسی جلاد کا لکھا ہوا ہے
(۴) گونج سے بالے کی زلف الجھی میں عاشق ہو گیا — یہ نہ خوف آیا کہ وہ افعی ہے یہ زنبور ہے
(۵) حریفوں پر خزانے ہیں کھلے یاں، ہجر گیسو ہے — وہاں پے بل ہے اور یاں سانپ کا بھی بل نہیں ہوتا
(۶) زلف نے پرتو دیں نام کو رہنے نہ دیا — آخر اس لام نے اسلام کو رہنے نہ دیا
(۷) میری زردیٔ رخ کا ذکر ہے لب ہائے جاناں پر — مزہ دیکھو کہ حلوے میں پڑا ہوں زعفراں ہو کر
(۸) ساری دنیا ہے اس کو پیاری اکبر — کہتا ہے کم آل جس کو حاصل ہے کمال

(یہ ایک قطعہ کا دوسرا شعر ہے)۔

اکبر پر اس لفظی صنعت گری کا اثر اس درجہ غالب تھا کہ نہ صرف غزلیات میں، بلکہ وہ اپنے مخصوص اکبری رنگ میں بھی بیشتر اسی لفظی الٹ پھیر سے بات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً

ان کے دستِ نازنیں سے پائی ٹی — اب کہاں باقی ہے ہم میں پائیٹی

اس شعر میں (پائی Tea) اور (Piety) کے تلازمہ کے سوا اور کیا ہے؟

بامذاق لکھنوی انداز کے اس قسم کے اشعار

حسینوں کے گلے سے لگتی ہے زنجیر سونے کی — نظر آتی ہے کیا چمکی ہوئی تقدیر سونے کی
بہت بے چین ہوں نیند آرہی ہے رات جاتی ہے — خدا کے واسطے جلد اب کرو تدبیر سونے کی
جماتی ہے لب نازک پہ ان کے رنگ اپنا — یہ شوخیاں تو ذرا دیکھو سرخیٔ پاں کی
ہوگیا بدر ہلال اس کا سبب روشن ہے — روز گھستا تھا تیرے در پہ جبیں تھوڑی سی
چاند پیارا ہے تو کیا اس سے سوا پیارا ہے — صحن میں بیٹھوں میں کیوں یار جو دالان میں ہو

کہئے کہ اس قسم کے اشعار کی اشاعت سے اس کے سوا اور کیا فائدہ ہو سکتا ہے کہ اکبر کی شاعری کے متعلق جو حسن عقیدت لوگوں کے دلوں میں ہے اسے زائل (یا کم) کر دیا جائے۔

کہہ دیا جائے گا کہ کلیات کی اشاعت سے فائدہ یہ ہے کہ اس طرح شاعر کا پورا کلام محفوظ ہو جاتا ہے۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ اس قسم کے کلام کی حفاظت سے بالآخر حاصل کیا ہے؟ ہزارہا شاعر ایسے گذر چکے ہیں جن کا کلام اسی قسم کا تھا (بلکہ بعض کے ہاں اس سے بھی اچھا) لیکن جب اُس کی حفاظت کو کسی نے ضروری نہیں سمجھا تو اس کی حفاظت کیلئے اتنی کد و کاوش کیوں ضروری ہے؟ کیا محض اس لئے کہ اس کلام کی نسبت اکبر کی طرف ہے؟ اگر یہی وجہ ہے تو ارباب بصیرت کے نزدیک یہ تو کوئی معقول وجہ نہیں۔ حفاظت کا معیار کلام کی ذاتی قدر و قیمت اور افادیت ہونی چاہئے نہ کہ اضافی نسبتیں۔ بقا اور استحکام کے لئے کم از کم قرآن نے تو یہی معیار بتایا ہے جب اس نے کہا کہ واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (الرعد) دنیا میں باقی رہنے کا حق اسی کو حاصل ہے جو نوع انسانی کے لئے نفع بخش ہے۔ لیکن جب یہ معیار نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو پھر معیار صرف اشخاص پرستی رہ جاتا ہے نہ کہ قدر جوہر۔ کلیات زیر نظر کی اشاعت میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے جس کا اظہار محترم مرتب نے ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ

(مطبوعہ نسخوں میں) ابتدائی کلام کو شاید کم زور سمجھ کر آخر میں ڈال دیا ہوگا لیکن اب اس کی ضرورت نہیں۔

اب حضرت اکبر کا ہر شعر کیا، ہر فقرہ متبرک بن گیا ہے۔

اس کے بعد ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ جب معاملہ بصائر و حکم سے آگے بڑھ کر عقیدت مندی کی وادیوں میں جا پہنچے تو وہاں دلیل و برہان بیکار ہو جاتی ہے۔ جہاں اس قسم کی چیزیں بھی "تبرکات" میں داخل سمجھی جائیں کہ

کس ناز سے کہتے ہیں وہ جھنجلا کے شب وصل — تم تو ہمیں کروٹ بھی بدلنے نہیں دیتے

وہاں مجال گفتگو کیا ہو سکتی ہے؟

اگر اکبر کا انتخاب شائع کیا جاتا تو (بعد کا کلام تو ایک طرف جس میں اکبر اپنی انفرادیت لئے ہوئے سامنے آتے ہیں) تغزل میں بھی اس قسم کے اشعار وجہ تسکین ذوق ہو جاتے۔

(۱) آرزو ہے مجھے اک شخص سے ملنے کی بہت — نام کیوں لوں کوئی اللہ کا بندہ ہوگا

(۲) خوب جی بھر کے ہولئے بدنام حق ادا کر دیا جوانی کا

(۳) محبت کا تم سے اثر کیا کہوں نظر مل گئی دل دھڑکنے لگا

اور اس قسم کے شعر بھی۔

میری حقیقتِ ہستی یہ مشتِ خاک نہیں بجا ہے مجھ سے جو پوچھے کوئی پتا میرا

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں بیچ پڑتے ہیں عقیدے، عقل، عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

لیکن اکبر کی شاعری کا حقیقی رنگ ان کے ان قطعات میں جا کر کھلتا ہے جو ان کے مخصوص انداز میں ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ دو چار جلدوں میں سارا کلام چھاپنے کی بجائے اس حصۂ کلام کا عمدہ سا انتخاب شائع کر دیا جاتا تو بہت موزوں رہتا۔

جناب اکبر شاعر سے زیادہ ایک مفکر اور مصلح کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ جہاں تک مفکر ہونے کا تعلق ہے، ان کے ہاں کوئی مربوط فکر نہیں۔ یہاں وہاں کچھ فکری آثار بکھرے ہوئے دکھائی دے جاتے ہیں، لیکن بے ربط اور بے نظام۔

باقی رہا ان کا مصلحِ قوم ہونا، سو ہمارے نزدیک یہ ایک بڑی تلخ حقیقت ہے کہ ان کی یہ حیثیت قوم کے لئے مفید ہونے کی بجائے بہت نقصان رساں ثابت ہوئی۔ آج ہم ان کے طنزیہ اشعار سے صرف ذہنی لذت لیکر وقتی طور پر تفریح کا سامان پیدا کر لیتے ہیں۔ لیکن جس زمانے میں انھوں نے یہ روش اختیار کی تھی اسے سامنے لائیے تو پھر ان اشعار کو پڑھ کر ہنسی نہیں آتی، دل کو صدمہ ہوتا ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ غدر کے بعد مسلمانانِ ہند کس نازک دور سے گذر رہے تھے۔ انگریز کی نگاہوں میں مسلمان باغی تھا اس لئے اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس کی ملی حیثیت کو ختم کر دیا جائے گا۔ ہندو کی نگہ دور رس نے بھانپ لیا تھا کہ اسے کس طرح انگریز کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام لینا چاہئے۔ مسلمان چکی کے ان پاٹوں میں گھر چکا تھا۔ رفتہ رفتہ، ڈاکٹر ہنٹر کے الفاظ میں، اس کی حیثیت محض ہیزم کش اور آب بردار کی رہ گئی تھی۔ یہ تھے وہ حالات جن کا جائزہ سرسیدؒ کی نگہ ژرف بیں و دور رس نے لیا۔ اس نے احوال و ظروف کا تجزیہ کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ انگریز کی قوتوں کا راز علوم جدیدہ کی تحصیل میں ہے۔ یہی وہ علوم ہیں جن سے سائنٹفک ریسرچ کے دروازے کھلتے ہیں۔ جو قوم ان علوم سے بہرہ یاب نہیں ہوتی، کارگہِ حیات میں اس کا کوئی حصہ نہیں رہتا۔ دوسری طرف اس نے دیکھا کہ ہندو ایک گہری چال چل رہا ہے اور اس کی سازش کا علاج بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ جس تعلیم کے راستے وہ انگریزوں کے قریب ہوتا چلا جا رہا تھا، اسی تعلیم کے ذریعے اس کے ان حربوں کی روک تھام کی جائے۔ سرسید کی نگاہ کس قدر دور رس تھی اس کا اندازہ اس ایک بات سے لگائیے کہ اس نے ۱۸۶۷ء میں اس حقیقت کو بھانپ لیا کہ

ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے مشترک کوشش کرنا محال ہے۔ (حیاتِ جاوید)

ان حالات کے پیشِ نظر اس نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو تعلیم جدید سے بہرہ یاب کرنا نہایت ضروری ہے۔ اسی فیصلے کی عملی صورت

تحریکِ علی گڈھ کے نام سے متعارف ہوئی۔ اس تحریک کا سامنے آنا تھا کہ قدامت پرست طبقہ پنجے جھاڑ کر سرسید کے پیچھے پڑ گیا۔ ان کی دقیانوسیت کو اس تحریک میں اپنی موت دکھائی دیتی تھی اس لئے انھوں نے اس تحریک کی مخالفت میں متحدہ محاذ قائم کر لیا۔ مُلّا کی طرف سے اس کی مخالفت کچھ تعجب انگیز نہ تھی۔ اس لئے کہ اس کے نزدیک ہر کہنہ اور بوسیدہ تصور مقدس اور متبرک ہو جاتا ہے اور ہر نئی بات بدعت۔ اور کل بدعۃ ضلالۃ و کل ضلالۃ فی النار۔ (ہر نئی بات گمراہی ہوتی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں لیجانے والی) لیکن افسوس یہ ہے کہ اکبر جیسی شخصیت بھی انہی مخالفین کے ٹولے میں شریک ہو گئی اور نہ صرف شریک ہو گئی بلکہ اس مخالفت میں پیش پیش نظر آنے لگی۔ انھوں نے اودھ پنچ کی وساطت سے اس تحریک کے خلاف مسلسل و متواتر "جہاد" جاری رکھا اور مسلمانوں کو تحریک علی گڑھ کی حمایت سے التزاماً روکا۔ وہ تو یوں کہئے کہ مبداءِ فیض نے سرسید کو ایسا عزم راسخ اور کوہ تمثال استقلال بخشا تھا جس سے اس مردِ میداں کے پاؤں ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹے۔ ورنہ اگر وہ کہیں ذرا سی ہمت بھی ہار دیتا اور مخالفین کا گروہ کامیاب ہو جاتا تو ہندوستان اور پاکستان کے مسلمان ایک مدت سے گونڈوں اور بھیلوں کی برادری میں شامل ہو چکے ہوتے۔ پھر نہ یہاں اقبال پیدا ہوتا نہ جناح۔ نہ پاکستان بنتا نہ اس کی کابینہ۔ نہ کراچی میں مجلس اقبال ہوتی نہ بزمِ اکبر۔

اکبر کو فطرت نے طنزیہ تنقید کا ایک خاص انداز بخشا تھا۔ اس نے اس کے ذریعہ مغرب کی ہر شے کے خلاف بغاوت اور نفرت کے جذبات ابھارے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مغرب کی ہر شے اچھی بھی نہیں لیکن جس انداز سے اکبر اور ان کے رفقائے مغرب کی ہر شے کی مخالفت شروع کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدامت پرستی کی تنگ نظری کو بڑی تقویت مل گئی اور مسلمانوں میں ۔ ۔ ۔ علومِ جدیدہ کی ترویج کی رفتار بہت سست پڑ گئی۔ یہ بہت بڑا نقصان ہے جو اکبر کے ہاتھوں قوم کو پہنچا۔ یعنی اس ذہنیت کا استحکام کہ ہر نئی چیز قابلِ نفرت ہوتی ہے اور ہر پرانی چیز قابلِ تعظیم۔ اکبر کے نفرت آگیں طنز نے کس ٹائپ کی ذہنیتیں پیدا کر دیں اس کا اندازہ لگانا ہو تو عبدالماجد صاحب دریابادی کا صدق اٹھا کر دیکھئے۔ "ذبابی ذہنیت"[1] کا آئینہ سامنے آجائے گا۔ مغرب کی ہر بات سے نفرت۔ ہفتہ بھر میں وہاں ہزار باتیں اچھی ہوں کسی ایک کا تذکرہ نہیں۔ لیکن جہاں جہاں کوئی برائی نظر پڑے اسے چن چن کر تلاش کیا جائے گا اور انتہائی طنز و تشنیع کے انداز سے اس پر تنقید کی جائے گی۔ وہاں کے حسین و جمیل باغات، انھیں "غلاظت گھر" دکھائی دیں گے۔ اپنے ہاں کے سڑے ہوئے حجرے جبریل کے مسکن نظر آئیں گے۔ وہاں کے ہوائی جہاز، ریل، وغیرہ دجال کی سواریاں بتائی جائیں گی۔ اپنے ہاں کی رتھیں اور بہلیاں، براق و رفرف کا سا تقدس لئے ہوئے نگاہوں سے گذریں گی۔ یورپ کی ہر نئی سائنٹفک تحقیق سے انھیں بوئے الحاد آئے گی اور اپنے ہاں کے بچکے ہوئے سینے اور سکڑی ہوئی پیشانیاں انھیں مہبطِ انوارِ خداوندی دکھائی دیں گی۔ غرضیکہ ہر وہ شے جس میں حسن، نادرہ کاری، صنعت گری، تسخیرِ فطرت، کے آثار دکھائی دیں ان کے نزدیک جہنم رسید کر دینے کے قابل ہوگی اور وہ تمام بوسیدہ ہڈیاں جن کی عفونت سے دماغ پھٹ رہا ہو، وجۂ تزئین جنت

---

[1] مکھی کی فطرت ہے کہ جہاں کہیں زخم یا غلاظت ہو، وہیں بیٹھے گی خواہ آس پاس کیسی ہی صاف ستھری جگہ کیوں نہ ہو۔ اس قسم کی ذہنیت کو ہم نے ذبابی ذہنیت (ذباب۔ مکھی) سے تعبیر کیا ہے۔

قرار پائیں گی۔ یہ عقل و خرد اور علم و بصیرت کی۔ . . . . باتوں کا مذاق اڑائیں گے اور جتنی کوئی بات خلاف عقل اور قرینِ توہم پرستی ہوگی اتنے ہی اس پر سبحان اللہ اور مرحبا کے غلغلے بلند کریں گے اور اس کا نام رکھیں گے ایمان بالدلیل۔ سید سلیمان ندوی صاحب کی سیرت النبیؐ کی جلدیں اٹھا کر دیکھئے ورق ورق پر اس کی مثالیں ملیں گی۔ یہ ہے وہ ذہنیت جو اس تحریک کی پیداوار ہے جسے علی گڈھ تحریک کا ردِ عمل کہا جاتا ہے اور جس کے قائدین میں اکبر کی حیثیت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ یہ تو خدا کا احسان تھا کہ سرسید کے بعد یہاں اقبال پیدا ہوگیا جس نے کہا کہ مغرب کا علم و ہنر ہماری گم کردہ متاع ہے۔ اسے ہر طریق سے حاصل کرو۔ البتہ اس کے میکانکی تصورِ حیات سے احتراز برتو۔ جو اسلامی تصورِ زندگی کا نقیض ہے۔ اس کے برعکس، مشرق کی "تریاکی روح" کو بھی فنا کردو کہ اس نے صدیوں سے قوم کو قبرستانوں کا محافظ بنا رکھا ہے، لیکن اسلاف کی متاعِ علمی میں جو کچھ اچھا ہے اسے سنبھال کر رکھو۔ اس نے کہا کہ

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

یہ سرسید کی دور نگہی اور اقبال کی بصیرت کا صدقہ ہے کہ ہم آج دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہیں ورنہ ان قدامت پرست ذہنیتوں نے ہمیں کہیں کا نہ رہنے دیا ہوتا لہٰذا جہاں تک اکبر کے مصلح ہونے کا تعلق ہے، بس اتنا ہی اچھا ہے کہ اس کی طنز آمیز شاعری سے وقتی تفریح کا سامان بہم پہنچا لیا جائے۔ یہ امر موجبِ اطمینان ہے کہ عام طور پر اکبر کو اب ایک مصلح اور مفکر کی حیثیت دی بھی نہیں جا رہی۔ کچھ دنوں تک لوگ اس کے طنزوں سے لطف اندوز ہوں گے اس کے بعد ان کی یہ چاشنی بھی ختم ہو جائیگی۔ بقا صرف حقائق کیلئے ہے، لطائف کے لئے نہیں۔ لطائف کی نشر و اشاعت سے افراد کے ذاتی ذوق یا جذبۂ عقیدتمندی کی تسکین تو ہو سکتی ہے، ملت کے مفید مطلب کوئی تعمیری کام نہیں ہو سکتا۔ بہتر ہوتا کہ بزمِ اکبر، ملت کی فکری تعمیر کو پیشِ نظر رکھتی۔ اس کے لئے اکبر کے کلام سے بکھرے ہوئے حقائق کو چن کر الگ کر لیا جاتا۔ بس اتنا ہی کرنے کا کام تھا۔

کلیات، کی یہ جلد ایسی عمدہ چھپی ہے کہ آجکل کم کتابیں اس کی مثال پیش کر سکتی ہیں۔ کتاب متوسط تقطیع کے قریب ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ مجلد کی قیمت چھ روپے فی نسخہ ہے۔ اور ناظم شعبۂ تصنیف و تالیف بزمِ اکبر، کراچی سے مل سکتی ہے۔

۳- Makers of Pakistan.

موج کوثر پر ریویو لکھا جا چکا تھا کہ زیرِ نظر کتاب (شیخ محمد اشرف صاحب، پبلشرز اسلامک لٹریچر ہاؤس۔ لاہور) کی طرف سے موصول ہوئی۔ تحریک علی گڈھ کی حد تک اس کتاب کو ایک معنی میں موج کوثر کا شئی سمجھئے۔ وہی انداز ہے۔ وہی مقصود۔ حتیٰ کہ حوالے بھی کم و بیش وہی ہیں۔ اس کے مصنف "اے۔ ایچ۔ البیرونی۔ ایم۔ اے" ہیں اور کتاب ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی ہے۔ موج کوثر کا پہلا ایڈیشن اس سے بہت پہلے شائع ہوا تھا۔ اگر یہ توارد ہے تو بڑا تعجب انگیز ہے۔ عنوانات ہیں۔ سرسید، حالی، محسن الملک، وقار الملک، شبلی، ابوالکلام آزاد،

محمد علی جوہر، اقبال، قائداعظم اور لیاقت علی خاں۔ ان حضرات کی تصاویر بھی زینت دہ کتاب ہیں۔ کتاب موٹے کاغذ اور موٹے ٹائپ کے قریب ۳۶۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ جلد اور گرد پوش عمدہ ہیں۔ قیمت درج نہیں۔

معمارانِ پاکستان کے سلسلے میں شبلی اور ابوالکلام آزاد کا نام سمجھ میں نہیں آیا۔ سرسید نے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور جداگانہ حقوق و تربیت کا سوال اٹھایا اور اس کے رفقاء (حالی، محسن الملک اور وقار الملک) نے اس تحریک کو آگے بڑھایا۔ لیکن شبلی اور ابوالکلام آزاد وہ ہیں جنھوں نے اس تحریک کی سخت مخالفت کی۔ جب یہ تحریک بڑھتے بڑھتے تخیل پاکستان کے قالب میں ڈھل گئی تو اس وقت شبلی موجود نہیں تھے لیکن ان کے شاگرد (سید سلیمان ندوی) عمر بھر نیشنلسٹ رہے۔ باقی رہے ابوالکلام آزاد تو یہ حضرت گروہ مخالفینِ پاکستان کے سالار تھے اور اس وقت تک پاکستان کے بدترین دشمن ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ مٹھی بھر نیشنلسٹ مسلمان اس تحریک کی مخالفت نہ کرتے تو نہ صرف یہ کہ پاکستان بہت پہلے مل چکا ہوتا اور مکمل صورت میں ملتا۔ بلکہ مصیبتوں کے جو طوفان اس پر امنڈے ہیں، یہ ان سے محفوظ و مصئون رہتا۔ مسلمانوں کی قتل و غارتگری اور تباہی و بربادی کے بیشتر ذمہ دار یہی نیشنلسٹ مسلمان ہیں۔ حیرت ہے کہ البیرونی صاحب کو یہ جرأت کس طرح سے ہوگئی کہ ابوالکلام آزاد کو سرسید، محمد علی، اقبال اور جناح کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا۔ اگر آزاد صاحب بھی پاکستان کے بنانے والوں میں سے ہیں تو اسے برباد کرنے کی مشئوم کوشش کرنے والوں کو کہاں سے تلاش کیا جائے گا؟ ہندوؤں کا (Show - Boy)، ملتِ اسلامیہ کا بدترین دشمن اور قائداعظمؒ کے دوش بدوش، معمارانِ پاکستان کے زمرے میں شریک؟

آں چہ من بینم، بہ بیداری است یارب، یا بہ خواب؟

یہی نہیں کہ مصنف نے ابوالکلام آزاد کو عہد ماضی کے ہیرو کی حیثیت سے پیش کیا ہے بلکہ وہ تو یہ بھی امید لگائے بیٹھے ہیں کہ آزاد صاحب کے خواب کی تعبیر پاکستان میں پوری ہوگی، اور پوری ہوگی اسلامی جماعت کے ہاتھوں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> وہ قوتیں جو ۱۹۱۳ء میں ابوالکلام آزاد کی وساطت سے پیدا ہوئی تھیں انھیں اب اسلامی جماعت کے امیر مولانا مودودی، پھر ایک نقطہ پر مرتکز کر رہے ہیں۔ جو لوگ پاکستان میں تھیاکریسی حکومت کو دیکھنا چاہتے ہیں وہ اسے محسوس کریں یا نہ کریں لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ اسی راستہ کو اختیار کر رہے ہیں جس کا سراغ مدیر الہلال نے دیا تھا۔ تحریک اسلامی جماعت کے قائدین اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہیں حتیٰ کہ ان میں سے بعض نے ۱۹۴۷ء میں اس امید کو ظاہر کیا تھا کہ مولانا آزاد جنھوں نے ۱۹۱۳ء میں مسلمانانِ ہند کے سامنے حکومتِ الٰہیہ کو بطور منزل پیش کیا تھا، اب پھر ان کی قیادت سنبھال لیں گے۔

چنانچہ حکومتِ الٰہیہ اور علمائے مفکرین کا مرتب، الہلال سے طول طویل اقتباسات پیش کرنیکے بعد لکھتا ہے:۔

> جو لوگ تھیاکریسی کا قیام چاہتے ہیں کیا ان میں سے کوئی بھی ایسا ہو سکتا ہے جو اس ہستی کو محبت کی نگاہوں سے نہ دیکھے جس نے پہلے پہل اس منزل کا سراغ دیا تھا اور یہ نہ چاہے کہ اس تحریک کی باگ پھر انہی کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے؟ انشاء اللہ وہ مبارک دن آئے گا۔ اور بہت جلد آئیگا جب مولانا ابوالکلام

آزاد، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا حسین احمد مدنی اور مفتی کفایت اللہ سب ایک ہی صف میں کھڑے دکھائی دیں گے۔

اس اقتباس میں جن چار لیڈروں کا ذکر کیا گیا ہے وہ پاکستان کے مخالف تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد یقیناً اس سیاسی قیادت کے مخالف تھے جس نے پہلے مسلمانوں کے لئے تحفظات حاصل کئے اور اس کے بعد ہندوستان کے ایک حصہ کو الگ کرکے اسے مسلمانوں کا نشیمن بنایا۔ لیکن تاریخ کے صفحات اس قسم کی ستم ظریفیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اگر مولانا مودودی اور ان کے شریک کار کامیاب ہو گئے تو پاکستان میں سرسید، اقبال اور جناح کے تصورات کے مطابق حکومت قائم نہیں ہوگی بلکہ ان تصورات کی حکومت ہوگی جنھیں ابوالکلام آزاد نے عام کیا تھا۔ (ص ۱۴۷)

یہ ہیں البیرونی صاحب کے نزدیک پاکستان کے مستقبل کے ممکنات! چونکہ البیرونی صاحب کو مودودی صاحب اور ابوالکلام آزاد صاحب سے عقیدت نظر آتی ہے اس لئے چہ عجب کہ ان کا یہ اندازہ محض قیاس ہی پر مبنی نہ ہو۔

تاریخ کے صفحات فی الواقعہ ستم ظریفیوں سے بھرے ہوئے ہیں اور ان میں سے ایک بڑی ستم ظریفی یہ بھی ہوگی اگر (خدانکردہ) دنیا نے یہ دیکھ لیا کہ

زاغوں کے تصرف میں ہے شاہیں کا نشیمن

بہرحال، اسوقت یہ ستم ظریفی تو دنیا نے دیکھ ہی لی ہے کہ پاکستان میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں جناح اور ابوالکلام آزاد دونوں معمارِ پاکستان بنائے گئے ہیں!

رسالۃ الشرق

ڈاکٹر اقبال مرحوم کے پیام مشرق کا عربی ترجمہ رسالۃ الشرق جو ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے کیا ہے میں نے بامعان نظر مطالعہ کیا۔ اور ایک بار نہیں بلکہ کئی بار۔ مجھے بڑا اطمینان ہوا کہ ڈاکٹر اقبال کا یہ عدیم المثال دیوان عربی زبان میں نہایت خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ منتقل ہو گیا۔ ۱۹۲۴ء میں جب پیام مشرق شائع ہوا تھا ڈاکٹر اقبال نے اس کی ایک کاپی مجھے بھی بھجوائی تھی۔ اور میں نے رسالہ جامعہ میں اس پر تبصرہ لکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب موصوف کے اس شعر پر

نوائے من بہ عجم آتش کہن افروخت عرب زنغمۂ شوقم ہنوز بے خبر است

لکھا تھا کہ مجھے یقین ہے کہ جب اٹالین اور انگریزی وغیرہ مغربی زبانوں میں کلام اقبال کے ترجمے ہو رہے ہیں تو اہل مصر جو اس معاملہ میں یورپ کے کسی ملک سے پیچھے نہیں ہیں اور جنھوں نے ٹیگور تک کا عربی میں ترجمہ کر لیا ہے اپنی اس ملی بضاعت کو عربی میں منتقل کئے بغیر نہیں رہیں گے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب وہ آرزو پوری ہوئی، اور نہایت اطمینان بخش طریقہ سے پوری ہوئی۔

ایک زبان سے دوسری زبان میں نظم کا نظم میں ترجمہ کرنا اس طرح کہ شعر کی روح اور خیال کا اسلوب باقی رہے آسان نہیں ہے۔ ڈاکٹر عزام اس لحاظ سے بہت کامیاب ہیں کہ انھوں نے اصل کی بہت سی خوبیاں ترجمہ میں قائم رکھی ہیں۔ بلکہ بعض نظموں کے ترجموں

میں تو انھوں نے وہ ترنم ریزی بھی پیدا کی ہے جو اصل میں ہے۔ مثلاً نغمہ حادی الحجاز۔ اصل پڑھئے اور ترجمہ پڑھئے ایکساں لطف آتا ہے۔ لالۂ طور کے ترجمے تو بہت ہی صاف اور رواں ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ غزلیات کے ترجمے بھی اسی طرح دلکش ہیں حالانکہ یہ بہت ہی مشکل کام تھا۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے ترجمہ کی زبان میں کہیں گنجلک اور تعقید نہیں آنے دی ہے۔ اور بہت سلیس بنانے کی کوشش کی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ ہم ان سے زھاوی[1] یا رصافی یا شوقی یا حافظ بک ابراہیم کی شاعری کی توقع نہیں رکھ سکتے تھے اور نہ رکھنا چاہیئے تھا کیونکہ آزاد شاعری میں ہی شاعر اپنے کمالات دکھا سکتا ہے۔ ترجمہ کی پابندیاں اس کو ایسا مقید رکھتی ہیں کہ وہ ایک متعین راستہ سے قدم آگے بڑھا نہیں سکتا۔ نہ زبان میں نہ خیال میں۔ ان پابندیوں کے ساتھ دیکھا جائے تو اس ترجمہ کی خوبی کی قدر ہوتی ہے۔ لمعات جس میں انھوں نے اسرار خودی اور رموز بیخودی کی تعلیمات کا خلاصہ پیش کیا ہے اور بھی واضح اور صاف ہے کیونکہ اس میں فی الجملہ آزادی تھی۔

الغرض یہ عربی دنیا کے لئے ایک نیا تحفہ ہے اور ڈاکٹر عزام اس پر ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں اور ان کا کام قابل تحسین و مبارکباد ہے۔ بعض بعض نظموں کے ترجمے انھوں نے چھوڑ دیئے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر اقبال کہتے ہیں۔

بارکشِ اہرمن، لشکریِ شہریار — ازپئے نانِ جویں تیغِ ستم برکشید
زشت بچشمش نکوست، مغز نداند زپوست — مردکِ بیگانہ دوست، سینۂ خویشاں درید
داروئے بیہوشی است، تاج، کلیسا، وطن — جانِ خدا داد را، خواجہ بجامے خرید

یہ تین شعر ایسے ہیں کہ کوئی بالشویک تین سو صفحوں کی کتاب بھی لکھے تو اس خوبی سے اپنے مطلب کو ادا نہ کر سکے گا جس خوبی سے ڈاکٹر صاحب نے اس کو ان تین شعروں میں بیان کر دیا ہے۔ اسی قسم کے اور بھی اشعار ہیں جو چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ حالانکہ یہ چھوڑنے کے قابل نہ تھے۔

اسلم جیراجپوری

۲۰ راگست ۱۹۵۱ء

[کتاب، منیجر کتاب لمیٹڈ، رالسن روڈ کراچی سے مل سکتی ہے۔ طلوع اسلام]

[1] جمیل زھاوی، معروف رصافی، ملک الشعراء شوقی اور حافظ بک یہ جدید عربی شاعری کے ممتاز ترین ارکان ہیں۔

اجتماعِ عید

جس کی تلاش ہے اُسے پائیں تو عید ہو
جو بھی خوشی ہو دل سے منائیں تو عید ہو

مطلب مبارک اور سلامت کا جان کر
دیں ایک دوسرے کو دعائیں تو عید ہو

سینے سے سینہ سب نے ملایا تو کیا ہوا
احباب دل سے دل بھی ملائیں تو عید ہو

سب کو خود اپنی شان بڑھانے کا ہے خیال
ملّت کی شان مل کے بڑھائیں تو عید ہو

کچھ ہیں بہت غریب تو کچھ ہیں بہت امیر
دونوں کو اعتدال پہ لائیں تو عید ہو

قانونِ عام اور ہے آئینِ شرع اور
دنیا سے اس دوئی کو مٹائیں تو عید ہو

بخشا ہے ہم کو دین نے کیا خوب اجتماع
کچھ اس سے فائدہ بھی اٹھائیں تو عید ہو

ہم سب نے جمع ہو کے دوگانہ کیا ادا
ہوں اتحاد کی بھی ادائیں تو عید ہو

مل کر تو ہم بھی عید مناتے ہیں اے اسدؔ
لیکن سب ایک ہو کے منائیں تو عید ہو

اسدؔ ملتانی

حقایق و عبر

۱۔ کراچی۔ لندن مذاکرہ اس امر کا احساس ہر صاحب بصیرت کے لئے وجہ مسرت ہے کہ دنیائے علم و تحقیق میں ہر نیا انکشاف، قرآن کے کسی نہ کسی دعوے کی دلیل بن کر سامنے آجاتا ہے اور اس طرح یہ حقیقت رفتہ رفتہ بتدریج نکھرتی چلی جاتی ہے کہ سنریھم ایاتنا فی الافاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق۔ "ہم انسان کی داخلی اور خارجی دنیا میں اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے حتی کہ یہ امر نوعِ انسانی پر واضح ہو جائے گا کہ قرآن نفس الواقعہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے"۔ آج سے چودہ سو سال پہلے جب دنیا کی کیفیت یہ تھی کہ ایک بستی کے رہنے والے بمشکل دوسری بستی والوں سے متعارف ہو سکتے تھے، قرآن نے اس حقیقتِ عظمیٰ کا اعلان کیا کہ تمام نوعِ انسانی ایک عالمگیر برادری ہے (کان الناس امۃ واحدۃ) بہت کم لوگوں نے اس اعلان کو درخورِ اعتنا سمجھا اس لئے کہ یہ اتنی بعید سی بات تھی جو انسان کے سمٹے ہوئے ذہن میں سما ہی نہیں سکتی تھی۔ لیکن زمانے کے علم و تحقیق کی سطح بلند ہوتی گئی حتی کہ آج تار، لاسلکی اور ریڈیو نے گھر گھر اعلان کر دیا کہ دنیا ایک بستی سے بڑی نہیں بلکہ یوں کہئے کہ ایک کمرہ ہے جس میں ہر شخص، دوسرے شخص سے، جب وقت جی چاہے بات کر سکتا ہے۔ اس حقیقت کا مشاہدہ، ۱۵ اگست کی شام کو جب پاکستان کے وزیر خارجہ چودھری محمد ظفر اللہ خاں نے، کراچی میں بیٹھے بیٹھے، مغرب کے مشہور مورخ، پروفیسر ٹوئین بی (Toynbee) سے لندن میں باتیں کیں۔ سوال کرنے والے پروفیسر صاحب تھے اور مجیب چودھری صاحب۔ پروفیسر نے تمہیداً کہا کہ

> اسلام ان روایات کا حامل ہے جو اس پر آشوب زمانے میں، دنیا کی مشکلات کے حل کے سلسلے میں بہت کچھ پیش کر سکتی ہیں۔ ان میں سب سے درخشندہ روایت، اسلام کی وہ تعلیم ہے جو قومیتوں اور نسلوں کے امتیازات کو مٹاتی ہے۔

پروفیسر صاحب نے اس حقیقت کے اعتراف سے اپنی بالغ نظری اور ژرف نگہی کا ثبوت دیا۔ اس کے بعد انھوں نے پاکستان کا ذکر کیا اور کہا کہ دنیا کی اس سب سے بڑی اسلامی مملکت سے توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ اسلام کی روشنی میں دنیا کے مسائل کے حل کرنے میں بہت کچھ کریگی۔ ازاں بعد، پروفیسر صاحب نے چودھری صاحب سے ایک سوال براہ راست کیا۔ اور وہ سوال یہ تھا کہ آج دنیا جن لاینحل مسائل سے دوچار ہے، ان میں اقتصادی مسئلہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور اقتصادی مسئلہ کی اصل و بنیاد کاشتکاروں کا مسئلہ ہے۔ (یعنی کاشتکاروں اور زمینداروں کا تعلق) یہ مسئلہ چونکہ خود پاکستان کے سامنے بھی ہے اسلئے دریافت طلب امر یہ ہے کہ پاکستان اس مسئلہ کا حل کس طرح کرنا چاہتا ہے؟

سوال بڑا اہم تھا۔ ایسا اہم کہ آج ساری دنیا کی سیاست اور معاشرت کے انقلاب کا دارومدار اس سوال کے حل پر موقوف ہے۔ پروفیسر صاحب پہلے کہہ چکے تھے کہ اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ انسانی معاشرے کے اہم اور بنیادی مسائل کا حل پیش کرتا ہے اور چونکہ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے، اس لئے سوال یہ تھا کہ اسلام کی تعلیم کی روشنی میں پاکستان اس مسئلہ کا حل کس طرح کرنا چاہتا ہے۔

سوال بڑا اہم تھا۔ براہ راست تھا۔ خود سائل کی شخصیت بڑی ممتاز تھی۔ دوسری طرف مجیب اس اسلامی حکومت کا ذمہ دار رکن تھا جسے دعوے ہے کہ وہ دنیا میں اسلامی تصوراتِ حیات کی تجربہ گاہ ہے۔ ایک دنیا، اس سوال کے جواب کے لئے گوش برآواز تھی۔ درحقیقت یہ کسوٹی تھی اس امر کے پرکھنے کی کہ مسلمانوں کا یہ دعوے ہی دعوے ہے کہ اسلام دنیا کے اہم مسائل کا حل اپنے اندر رکھتا ہے یا فی الواقعہ اسلام میں یہ ممکنات موجود ہیں!

یہ تھا سوال۔

آپ کو معلوم ہے کہ اس کا جواب کیا دیا گیا؟ جواب میں کہا گیا کہ ہاں! ہم نے ہائیڈرو الیکٹرک اسکیم بنائی ہے جس سے ہماری انڈسٹریز کو فائدہ پہنچے گا اور انڈسٹریز اور زراعت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہم نے خود زراعت کی ترقی کے لئے بھی کچھ تجاویز سوچی ہیں۔ سندھ اور پنجاب میں ایسی قانونی اصلاحات کی ہیں جن سے مزارعین کو مزید رعایات حاصل ہو جائیں گی۔ مشرقی پاکستان میں دوامی بندوبست کی لعنت کو دور کر دیا ہے۔

یہ تھا جواب اس سوال کا کہ اسلام، زمینداروں اور کاشتکاروں کے مسئلہ کا حل کس طرح کرتا ہے، کیونکہ یہ مسئلہ آج دنیا کے اہم مسائل میں سے ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ چودھری صاحب اس سوال کا جواب دینے کے اہل ہی نہیں تھے اس لئے کہ ان کے ہاں اسلام کا تصور ایک مذہب کا ہے، دین کا نہیں۔ اور اگر وہ اس کے اہل ہوتے بھی، تو بھی صحیح جواب نہ دے سکتے۔ اس لئے کہ ابھی پچھلے سال ان کے خلیفہ حضرت میرزا بشیر الدین محمود صاحب نے ایک کتاب شائع کی ہے جس میں اسلام کو ایک خالص سرمایہ دارانہ مذہب ثابت کیا ہے جس میں زمیندار بڑی بڑی زمینداریوں کے مالک ہو سکتے ہیں۔ جب حضرت صاحب کا ارشاد یہ ہو تو چودھری صاحب اس کے خلاف کس طرح لب کشائی کر سکتے تھے۔ اس لئے انھوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ پاکستان کی ہائیڈرو الیکٹرک اسکیم کا ذکر دیا جائے اور بنگال کے دوامی بندوبست کی تنسیخ کا کارنامہ دہرا دیا جائے۔ ذرا اسلام کی مظلومیت پر غور فرمائیے۔ ایک غیر مسلم، بین الاقوامی شہرت کا مالک، فاضل تاریخ اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ اسلام میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ دورِ حاضرہ کی مشکلات کا حل پیش کر سکے۔ اس اعتراف کے بعد وہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے وزیر خارجہ سے پوچھتا ہے کہ اس خاص مسئلہ کا حل اسلام کیا پیش کرتا ہے۔ اور اسے جواب ملتا ہے۔ ہائیڈرو الیکٹرک اسکیم! کیا اچھا ہوتا اگر محترم چودھری صاحب جواب میں یہ فرما دیتے کہ میں نے ابھی تک اس مسئلہ پر غور نہیں کیا۔ اس سے ایک تو خود ان کے متعلق یہ صورت نہ ہوتی کہ

تا مردِ سخن نہ گفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد

دوسرے، اسلام کی طرف سے مغربی علماء کے دل میں جو عقیدت باقی ہے وہ زائل نہ ہوتی۔ وہ تو یوں کہئے کہ ان لوگوں کا ایٹیکٹ انھیں اس کی اجازت نہیں دیتا، ورنہ عجب نہ تھا کہ اس جواب پر، پروفیسر ٹوئین بی ریڈیو ہی پر کھلکھلا کر ہنس دیتے۔ ان لوگوں کی نگاہیں بڑی دقیقہ شناس ہوتی ہیں۔ (بالخصوص پروفیسر ٹوئین بی جیسے مورخ کی نگاہیں جس نے دنیا بھر کی تہاذیب کا مطالعہ کرکے، اپنی بصیرت کے مطابق، عروج و زوالِ امم کے اسباب و علل کا تجزیہ کرکے رکھدیا ہے) انھیں اس قسم کی سطحی باتوں سے نہیں بہلایا جا سکتا۔

بنابریں، لندن اور کراچی کے اس سب سے پہلے مذاکرہ کا تجربہ بڑا افسوسناک رہا۔ تمام اقوامِ عالم تک، اسلام کا صحیح پیغام پہنچانے کا یہ موقعہ بہت عمدہ تھا۔ افسوس کہ یہ موقعہ نہ صرف رائیگاں گیا بلکہ مفکرینِ عالم کے دل پر اسلام کے متعلق ایک غلط نقش قائم کر گیا۔ اگر اس سلسلہ کو جاری رکھنا مقصود ہے تو ہم اربابِ حل و عقد سے گذارش کریں گے کہ وہ ان مذاکرات میں یا تو اسلام کو خارج از بحث قرار دیدیں اور اگر اسلام کو بحث میں لانا ہے تو اس کیلئے ایسے لوگوں کا انتخاب کریں جو اس قسم کے سوالات کا صحیح جواب دینے کے اہل ہوں۔

پروفیسر ٹوئین بی کا سوال بڑا واضح تھا اور اس کا جواب نہایت مختصر اور سوال سے بھی زیادہ واضح۔ جواب یہ تھا کہ اسلام میں کاشتکار اور زمیندار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے کہ اسلام میں زمین پر انفرادی ملکیت ہو ہی نہیں سکتی۔ زمین، ملت کی مشترکہ ملکیت ہوتی ہے جسے مملکت، انتظامی نقطہ نگاہ سے افرادِ ملت میں، حسبِ ضرورت تقسیم کر دیتی ہے۔ اس تقسیم میں حسبِ ضرورت ردوبدل ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے اسلامی نظام میں نہ کوئی زمیندار ہوتا ہے نہ کاشتکار۔ زراعت کرنے والوں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ پوری محنت اور دیانتداری سے کام کریں۔ لیکن انھیں اپنی ضروریات زندگی کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اسلام کے معاشی نظام میں ہر فردِ مملکت کے رزق کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے۔ نہ صرف رزق کی بلکہ افرادِ مملکت کی فطری صلاحیتوں کی کامل نشوونما کے اسباب و وسائل بہم پہنچانے کی بھی تاکہ انسان اس زندگی اور اس کے بعد کی زندگی کی سرفرازیوں سے بہرہ یاب ہو سکے۔

یہ تھا پروفیسر ٹوئین بی کے سوال کا جواب جس کی شہادت میں قرآن کی آیات پیش کرتے جانا چاہئے تھا۔ (طلوع اسلام میں اس موضوع پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے اس لئے قرآنی آیاتِ متعلقہ کو یہاں دھرانے کی ضرورت نہیں)۔ آج دنیا اسلامی نظام کے لئے تڑپ رہی ہے لیکن اسلام کا نام لینے والوں کی حالت یہ ہے کہ یا تو انھیں خود بھی علم نہیں کہ یہ نظام کیا ہے۔ اور اگر علم ہے تو مختلف مصلحت کوشیاں انھیں اس طرح گلوگیر ہو رہی ہیں کہ اس باب میں ایک لفظ بھی ان کے حلق سے نکلنے نہیں پاتا۔

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے؟

۲- سائنس اور خدا

غالباً ڈاکٹر آنج نے کہا تھا کہ سائنس کا ادھورا علم انسان کو لامذہب بنا دیتا ہے اور اس کی پختگی سے انسان صحیح معنوں میں خدا پرست ہو جاتا ہے۔ اس مقولے کی صداقت کے سلئے اپنے ہاں کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو دیکھنا چاہیئے اور دوسری طرف مغرب کے ائمہ سائنس کو۔ ہمارے ہاں صورت یہ ہے کہ جو طالب علم بی۔ ایس۔ سی (B.Sc.) تک سائنس کی چند ابتدائی کتابیں پڑھ لے وہ خدا، وحی، حیات بعد الممات وغیرہ کے خلاف اس طرح اعتراضات کرنے لگ جاتا ہے، گویا اس کے پاس اس انکار کے ایسے قطعی اور حتمی دلائل ہیں جن کا جواب دنیا کے علم و بصیرت میں کہیں نہیں۔ دوسری طرف مغرب کے ائمہ سائنس کی یہ کیفیت ہے کہ جوں جوں سائنس کے حدود وسیع ہوتے جاتے ہیں وہ اس طرح خدا پر ایمان لاتے چلے جاتے ہیں جیسے انھیں خدا سامنے نظر آرہا ہے۔ ہمارے دور میں سر ایڈنگٹن کا شمار ائمہ سائنس میں ہوتا ہے۔ اس کی تصانیف، بالخصوص (Nature of the Physical World.) اور (Science and the unseen world) کو دیکھئے۔ وہ کس طرح "عالم غیب" کو عالم شہود کی طرح آنکھوں کے سامنے لاتا چلا جاتا ہے۔ اسی ماہ 'ایڈنبرا میں' ایڈنگٹن میموریل لیکچرز کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ اس میں سب سے پہلا لیکچر سر ایڈمنڈ وٹیکر نے دیا جس کا عنوان تھا "فلسفہ سائنس میں ایڈنگٹن کا اصول"۔ اس لیکچر کے دوران میں سر وٹیکر نے کہا:-

مادی فطرت نے ہماری بصیرت کے سامنے ایسے حقائق کو بے نقاب کر دیا ہے جو خود فطرت سے بھی زیادہ عظیم القدر ہیں۔ ان حقائق نے ہمیں ایک ایسے خدا کا پتہ نشان دیدیا ہے جو مادی کائنات میں محبوس نہیں بلکہ اس سے ماورا اور بے حد و نہایت ہے۔

یہ اصول کہ مادہ صرف اپنی ذات کے لئے موجود نہیں، بلکہ اس کے وجود سے مقصد یہ ہے کہ ہم میں اور خدا میں جو خلیج حائل ہو چکی تھی اسے پاٹ دیا جائے، ایسا اصول ہے جسے مذہب کی زبان میں یوں کہا جائے گا کہ فطرت اپنے اندر تقدس لئے ہوئے ہے۔ یہ وہ اصول ہے جو مذہب کی دنیا میں ایک مدت سے تسلیم ہوتا چلا آرہا تھا لیکن اب اسے فلسفۂ سائنس بھی تسلیم کر رہا ہے۔

یہ تصور کہ ایک ایسا ابدی قانون موجود ہے (جو زمان کی حدود سے ماوراء ہے اور) جسے ہم دل کی زبان سے سمجھ سکتے ہیں اور جو مادی کائنات میں رونما ہونے والے تمام حوادث پر غالب ہے (یعنی یہ حوادث اس قانون کے مطابق رونما ہوتے ہیں) طبعی سائنس کا روحانی پہلو ہے۔ جب ہم اس امر کا احساس کرتے ہیں کہ فطرت کا شعوری پیکر خود فطرت سے بھی پہلے کا ہے، یعنی یہ اس وقت بھی موجود تھا جب ابھی مادی کائنات کا کہیں ذکر تک بھی نہ تھا۔ اور یہ مربوط سلسلۂ کائنات جس کا انکشاف سائنس نے کیا ہے، ابدی تدابیر خداوندی کا صرف ایک ادنیٰ سا حصہ ہے۔ تو ان تصورات کے سامنے ہم مبہوت رہ جاتے ہیں۔

یہ کائنات جس کا ہمیں علم حاصل ہے، خدا کی طرح قدیم اور ازلی تو ایک طرف۔ شئونِ الٰہیہ میں سے ایک شان سے

زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ نہ معلوم اس قسم کی کتنی اور شئون ہمارے حیطۂ علم سے باہر ہیں۔ (Scotsman, 10.8.51)

یہ ہے مختصر سا اقتباس اس لیکچر کا جسے یورپ کے ایک بہت بڑے سائنسداں نے، برٹش ایسوسی ایشن کے جلسہ میں، ایک امامِ طبیعیات کی یاد میں دیا۔ اسے دیکھئے اور پھر اپنے ہاں کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو دیکھئے جو اس قسم کے دلائل پیش کرتے ہیں کہ

(۱) اگر خدا کو قدیم ماننا ہے تو مادہ ہی کو قدیم کیوں نہ مان لیا جائے۔

(۲) اگر خدا کے متعلق یہ سمجھ لینا ہے کہ اسے کسی نے پیدا نہیں کیا تو مادہ کے متعلق ہی کیوں نہ سمجھ لیا جائے کہ وہ از خود وجود میں آ گیا تھا۔

(۳) جب خدا کے متعلق یہ ماننا ہے کہ وہ علتِ اولیٰ (The first Cause) ہے تو پھر زندگی کے متعلق ہی کیوں نہ مان لیا جائے کہ وہ ایسی معلول (Effect.) ہے جو بغیر کسی علت (Cause) کے وجود میں آ گئی ہے۔

اور سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے "مذہب" کو ایسی شکست دیدی ہے جس سے وہ جانبر نہیں ہو سکتا!

لیکن اس میں قصور ان نوجوانوں کا نہیں۔ اصل قصور ہے اس نظامِ تعلیم کا جسے ہم نے ان کے لئے وضع کر رکھا ہے ہمارے کالجوں میں جو لوگ سائنس پڑھاتے ہیں ان کا علم خود اس قدر محدود ہوتا ہے کہ وہ مادہ کی چار دیواری سے آگے جا ہی نہیں سکتے۔ دوسری طرف جن حضرات کے سپرد "مذہب کی تعلیم" ہوتی ہے وہ انھیں اس قسم کے مسائل میں الجھائے رکھتے ہیں کہ کنوئیں میں چوہیا گر جائے تو کتنے ڈول نکالنے چاہئیں اور پاجامہ ٹخنوں سے کتنا اونچا رکھنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ ایسی درسگاہوں کے طالب علم اگر دہریے اور ملحد نہ بنیں تو اور کیا ہو!

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہماری درسگاہوں میں سائنس وہ پڑھائیں جنھیں قرآن پر عبور ہو اور قرآن وہ پڑھائیں جنھوں نے فلسفہ اور سائنس کو کھنگال ڈالا ہو۔ اس کے بعد آپ دیکھئے کہ انہی درسگاہوں سے کس قسم کے "مردانِ مومن" پیدا ہوتے ہیں۔ اقبال نے ہمارے دورِ محکومی کے نصابِ تعلیم کے متعلق کہا تھا کہ

محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی موسیقی و صورت گری و علم نباتات

لیکن ہمارے دورِ آزادی میں صورت، بد سے بدتر ہو گئی۔ اب تو

نہ وہ غزنوی سا مذاق ہے، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

۳۔ اساسِ قومیت

اگر کوئی آنے والا مورخ یہ سوال کرے کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے، ہمارے موجودہ دور نے، سب سے اہم کونسا تصور دیا تو اس کا جواب بلا تامل یہ دیا جائے گا کہ اس دور میں پھر سے

قرآن کے اس تصور کو بیدار کیا گیا کہ مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے نہیں اور اسلام میں قومیت کا مدار دین کی وحدت ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس میں کسی کو بھی کلام نہیں۔ یہی وہ تصور ہے جسے حکیم الامت علامہ اقبالؒ عمر بھر پیش کرتے رہے اور یہی وہ دلیل تھی جس کی بنا پر پاکستان کا مقدمہ جیتا گیا۔

لیکن اس دور کی ابھی دوسری پشت بھی نہیں آئی کہ خود پاکستان میں سے اس قسم کی آوازیں بلند ہونی شروع ہو گئی ہیں کہ یہ کہنا کہ اسلام میں قومیت کی بنیاد مذہب (یعنی دین) ہے، بہت بڑی غلطی ہے۔ یعنی پاکستان کو حاصل تو کیا ہے اسی ایک دلیل کی بنیاد پر اور جب پاکستان حاصل ہو چکا تو اب یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ یہ دلیل بہت بڑی غلطی پر مبنی ہے۔ یوں تو اس قسم کی آوازیں منتشر طور پر ادھر ادھر سے کئی مرتبہ سامنے آئیں لیکن روزنامہ آفاق (لاہور) کے "آزادی نمبر" میں سید نور احمد صاحب نے اپنے ایک مضمون (پاکستان کی قومی آئیڈیالوجی کے مبادیات) میں اس آواز کو (بزعم خویش) مدلل انداز سے اٹھایا ہے۔ وہ مضمون کی تمہید میں رقمطراز ہیں کہ

> قوم اور قومیت کے موضوع پر بعض حضرات نے اپنے آپ کو ایک پراگندہ خیال بحث میں الجھا رکھا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس موضوع پر چند ایسی مبادیات پیش کر دوں جن کے متعلق بحث کی گنجائش نہیں۔

یعنی سید صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مضمون میں اس اہم موضوع سے متعلق ایسی مبادیات پیش کر دی ہیں جو مسلمات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ مبادیات کیا ہیں؟ فرماتے ہیں۔

> صرف مذہب کی بنیاد پر مذہب کے تمام پیروؤں کو ایک قوم کہنا چاہیں تو انگلستان، فرانس، جرمنی، اسپین وغیرہ کے تمام باشندے بھی ایک قوم سمجھے جائیں گے جو واقعات کے سراسر خلاف ہے۔

آپ نے دلیل ملاحظہ فرمائی؟ یعنی چونکہ فرانس، جرمنی، انگلستان، اسپین وغیرہ کے باشندے، وحدتِ مذہب (عیسائیت) کے باوجود، اپنے آپ کو الگ الگ قوموں کے افراد سمجھتے ہیں اس لئے مسلمانوں کی یہ دلیل بے بنیاد ہے کہ اسلام میں قومیت کا مدار دین کی وحدت ہے!

دوسری دلیل ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہے:۔

> ایک بات جو اکثر کہی جاتی ہے یہ ہے کہ مختلف ممالک کے مسلمان اپنی جغرافیائی اور سیاسی حد بندیوں کے باوجود بہ حیثیت مسلمان ایک قوم ہیں کیونکہ وہ سب ایک خدا، ایک قرآن اور ایک نبیؐ کو مانتے ہیں۔ یہ بات واقعات کے خلاف ہے کیونکہ مختلف اسلامی ملکوں میں کہیں کوئی ایسا مشترک جذبہ کارفرما نظر نہیں آتا جو انھیں ایک سیاسی، آئینی، یا حکومتی وحدت بن جانے پر ابھارتا ہو۔

یعنی چونکہ اس وقت مختلف اسلامی ممالک، اشتراکِ دین کے باوجود، ایک قوم نہیں کہلاتے نہ ہی ان میں سردست کوئی ایسا جذبہ موجود ہے جو انھیں ایک آئینی وحدت پر آمادہ کر دے، اس لئے یہ دلیل غلط ہے کہ اسلام میں قومیت کا مدار دین پر ہے۔

ہم حیران ہیں کہ سید صاحب نے اس سلسلۂ دلائل کو آگے کیوں نہ بڑھایا، یہیں تک کیوں روک دیا۔ مثلاً انھیں یہ بھی کہنا چاہئے تھا کہ چونکہ اس وقت تمام اسلامی ممالک میں سے کسی میں بھی آئینِ حکومت اور قانونِ مملکت قرآن کے مطابق نہیں۔ اور نہ ہی ان میں اس امر کی کوئی امنگ پائی جاتی ہے کہ وہاں کا آئین اور قانون، قرآن کے مطابق ہو اس لئے یہ دعویٰ غلط ہے کہ اسلام میں آئین و قانونِ مملکت کی بنیاد قرآن پر ہونی چاہئے۔

اور چونکہ تمام اسلامی ممالک میں اس وقت اخلاقی انحطاط ہے اور کسی جگہ بھی کوئی جذبہ ایسا نظر نہیں آتا جس سے اخلاقی اصلاح کا خیال ابھرتا دکھائی دے، اس لئے یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ اسلام شرافت اور عزت کا معیار، بلندیٔ اخلاق کو قرار دیتا ہے۔

وقس علیٰ ہذا۔

قومیت کے متعلق جن خیالات کا اظہار سید صاحب نے اپنے مضمون میں کیا ہے، ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس قسم کے خیالات کو آہستہ آہستہ پاکستان کی فضا میں پھیلایا جا رہا ہے اور اس کے حق میں دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ اس سے یہاں کی غیر مسلم اقلیتوں کے دل میں اعتماد اور بھروسہ پیدا ہو جائے گا اور اس طرح

> پاکستان کے تمام باشندے بلا لحاظ مذہب اپنے آپ کو نہ صرف سیاسی اور آئینی اعتبار سے ایک ملکی وحدت خیال کرنے لگیں گے بلکہ جذباتی اور احساساتی اعتبار سے بھی اپنے آپ کو ایک قومی وحدت سمجھنے لگیں گے۔

یہ ہے وہ نگاہ فریب، دامِ ہمرنگِ زمیں، جسے متحدہ قومیت کی تحریک کے احیاء کے سلسلے میں اس طرح خاموشی سے بچھایا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ تحریک پاکستان کے دوران میں "دو قوموں" کے نظریئے کے مخالف تھے ان کے دل میں وہی خیالات رہ رہ کر کروٹیں لے رہے ہیں اور مختلف شکلوں اور متنوع پیکروں میں سامنے آ رہے ہیں۔ سچ کہا تھا حکیم الامت نے کہ

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات

دنیا کی مختلف قومیں، اپنی قومیتوں کے پیدا کردہ جہنم سے تنگ آ کر ایک عالمگیر حکومت (One-World Govt.) کے خیال کو متشکل کرنے کی فکر کر رہی ہیں اور ہمارے یہ مصلحینِ ملت ہیں جو خود مسلمانوں کے ممالک میں الگ الگ قومیتوں کو عین اسلام قرار دے رہے ہیں!

یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

فسانہ گشت حقیقت، حقیقت افسانہ

بہ بزم بادہ مغے زد چہ حرفِ رندانہ
کہ آب آمد و رفت است مے زمیخانہ

گرفتم این کہ محبت صنم پسند آید
نہ آنچناں کہ بتے را کند صنمخانہ

بحیرتم کہ چہ رفت است پارسایاں را
کہ کارِ خیرِ جہاں ہم کنند دزدانہ

چہ انقلاب پدیدار شد کہ می گردد
بدشت صاحب ہوش و بہ شہر دیوانہ

ہزار بار دل خود بمدرسہ بردم
ولے ز درسِ فقیہاں نگشت فرزانہ

ز تیرہ بختیٔ ما در رہ جہاد حیات
امام ماست کہ از راہ ہست بیگانہ

ہزار حیف کہ از مدتے بہ بزم حرم
نگشت شمع فروزاں نہ سوخت پروانہ

ذلیل و خوار از آنیم کہ بر لب ما
فسانہ گشت حقیقت، حقیقت افسانہ

خیال گمرہیٔ ہمرہاں مرا آشفت
بگیر دست مرا اے خیال جانانہ

(محمد ایوب)

نالہ پابند نے .....

مصنف ——— اختر انصاری اکبر آبادی

قیمت ——— دو روپیہ

ملنے کے پتے ——— کتاب لمیٹڈ رالسن روڈ۔ کراچی

ادارۂ فروغِ اردو۔ ایبک روڈ۔ لاہور

ہمارے نوجوان نامور شاعر اختر انصاری اکبر آبادی کی غزلوں اور گیتوں کا مجموعہ "نالہ پابند نے ....." حال ہی میں شائع ہوا ہے اور اس وقت تبصرہ کے لئے ہمارے سامنے ہے۔ ہم اس مجموعہ کا اس لئے سب سے زیادہ خیر مقدم کرتے ہیں کہ غزل کو گل و بلبل کی داستانوں سے نکال کر بھی اس کے حسن اور دل کشی کو قائم رکھا ہے، روایتی مضامین سے کہیں بھی اپنے فن کو آلودہ نہیں کیا گیا۔ شاعر روحانی گرفت سے نکل کر مشاہدات و تجربات کی روشنی میں آیا ہے اور اپنی غزلوں کو زندگی سے اتنا قریب کر دیا ہے کہ آپ بیتی پر جگ بیتی کا شبہ ہوتا ہے۔ پھر خصوصیت یہ بھی ہے کہ فن کی دلکشی اپنے مقام پر رہتی ہے۔ بعض طویل اور مشکل بحروں میں بے انتہا روانی کے ساتھ کامیاب تجربے کئے گئے ہیں۔ کلام میں پختگی اور قدرت بیان کی مثالیں نمایاں ہیں۔ آخر میں چند ہلکے پھلکے گیت ہیں ان میں بھی اختر صاحب روحان کی رو میں بہنے کے بجائے عمل و شعور کا درس دیتے نظر آتے ہیں۔ کتابت و طباعت بھی عمدہ ہے اور جلد بے انتہا خوبصورت۔ مجموعہ اس لائق ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے۔

عارف بٹالوی

(اشتہار)